ISSN 0974-7346

مئی ۲۰۲۳ء

جلد ۲۱۰—عدد ۵

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

سالانہ زر تعاون

ہندوستان	سالانہ ۳۵۰؍ روپے۔ فی شمارہ ۳۰؍ روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴؍ روپے۔ ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰؍ روپئے میں دستیاب۔ لائف ممبرشپ ۱۰۰۰۰؍ روپے ہے۔
دیگر ممالک	رجسٹرڈ ہوائی ڈاک ۲۹۴۰؍ روپے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔ اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔
بذریعہ ایمیل	اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ایمیل (ساری دنیا میں) ۳۵۰روپے سالانہ۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔

بینک ٹرانسفر کرکے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: Darul Musannefin Shibli Academy
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No.: 4761005500000051 - IFSC: PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

Darul Musannefin Shibli Academy, Azamgarh

* زر تعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کر دیا جائے گا۔
* معارف کا زر تعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
* خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
* معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
* کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Office Mobile: 06386324437
Email: info@shibliacademy.org
Website: http://www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۰ | ماہ شوال المکرم ۱۴۴۴ھ مطابق ماہ مئی ۲۰۲۳ء | عدد ۵

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر:۱۹

شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)

پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

info@shibliacademy.org

فہرست مضامین

شذرات

بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصود ہر پروانہ تھا

سخت جاں گداز واقعہ آخر واقع ہو کر رہا۔ اکیس رمضان المبارک اور اپریل کی تیرۃ تاریخ کو یہ روح فرسا خبر ملی کہ حضرت مولانا سید محمد رابع ندوی اپنے خالق حقیقی اور رب رحیم و ودود سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس طرح محض محفل دوشیں کا چراغ سحر ہی گل نہیں ہوا، علم و عرفان، محبت و معرفت، ایمان و یقین، رشد و ہدایت اور علم و حکمت اور تزکیہ و تربیت کی ان روایات کا وہ سلسلہ بھی گویا تھم سا گیا جو صدیوں کی خاندانی، ملی اور ملکی خصوصیات سے زندہ و تابندہ چلا آتا ہے۔ مولانا سید محمد رابع ندوی ۱۹۲۹ء میں تکیہ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں پیدا ہوئے، یعنی چورانوے سال کی حیات دنیوی، رب حی و قیوم سے ودیعت ہوئی، قریب ایک صدی کی ان کی زندگی ایک عہد بن گئی۔ ان کے نانا مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی کو ندوہ کے عہد جدید کے اولین معماروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ مولانا رابع حسنی ندوی کی وفات سے اس عہد جدید کی تکمیل یا خاتمہ سا نظر آتا ہے۔

***

مولانا کے خاندان کے متعلق کچھ لکھنا محض تحصیل حاصل ہے۔ بر صغیر میں شاید چند ہی خاندان ایسے ہوں گے جن کی صدیوں کی تاریخ سے اتنی عمومی واقفیت ہو، رائے بریلی کے خانوادۂ سادات کی شہرت علم و عمل کے تعلق سے ایسی رہی کہ کبھی اس خاندان کے بعض افراد سلاطین کے درباروں میں قدر و منزلت کی مسند پر نظر آئے تو کبھی فقر و تصوف کی خانقاہوں کی رونق بنے، تعلیم و تدریس اور تالیف و تصنیف تو اس خاندان کی سب سے ممتاز پہچان رہی اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے ہندوستان کے مسلمانوں کے امام اور امیر ہونے پر تو صرف عوام ہی نہیں، امت کے علماء اور مورخین کا بھی اتفاق ہے۔ مولانا نے مکتب کی تعلیم پہلے تکیہ میں اور پھر لکھنؤ اپنے ماموں ڈاکٹر عبدالعلی سے حاصل کی، ۱۹۴۱ء میں دارالعلوم ندوہ کے درجہ اول میں داخلہ لیا، مولانا سید حمید الدین فیض آبادی اور مولانا سید نورالحسن صاحب ان کے اولین اساتذہ میں تھے مولانا محمد اسباط صاحب سے بھی پڑھا، ایک عرصہ انہوں نے دیوبند میں بھی گذارا، قاری طیب صاحب سے حجۃ اللہ البالغہ کا درس لیا۔ مظاہر علوم میں مفتی محمود الحسن گنگوہی سے بھی کچھ اسباق پڑھے، واپس ندوہ آئے تو شاہ حلیم عطا، مفتی محمد سعید اعظمی، مولانا محمد ناظم ندوی، مولانا محمد اسحاق سندیلوی، مولانا محمد عمران خاں بھوپالی ندوی جیسے نامور اساتذہ سے فیض

اٹھانے کا موقع ملا، لیکن اصل تعلیم و تربیت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے زیر سایہ رہی۔ بیس برس ہوتے ہوتے ان میں وہ صلاحیت پیدا ہونے لگی جو بعد میں تدریس اور تصنیف و تالیف میں درجہ کمال کو پہنچ گئی۔ بیس بائیس سال کی عمر میں انہوں نے مولانا عبدالباری ندوی کی مشہور کتاب تجدید تصوف و سلوک کا عربی ترجمہ کر دیا جو بعد میں المنہج الاسلامی لتربیۃ النفس کے نام سے شائع ہوا۔ تدریس کی ذمہ داری ملی تو منشورات من ادب العرب اور معلم الانشاء کی ترتیب کا کام بھی سپرد ہوا۔ مولانا کی اس علمی و تعلیمی زندگی میں لکھنے سے زیادہ کتابوں کے مطالعہ کا دخل ہے۔ وہ کہتے تھے کہ کثرت مطالعہ کی وجہ سے لوگ ان کو مولوی مطالعہ کہنے لگے۔ لیکن کتابوں کے مطالعہ نے ان کو زندگی کے مطالعہ تک جس طرح پہنچایا وہ البعث الاسلامی، الرائد، تعمیر حیات جیسے رسائل اور ان کی متعدد کتابوں اور بے شمار مقالات و مضامین کے ذریعہ دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ مولانا کو ایک عظیم خانوادہ کی روشن روایات کے پاسبان اور امین ہونے کی توفیق قسام ازل نے اس وقت ودیعت کی جب قریب بائیس سال پہلے رمضان المبارک ہی کی بائیس تاریخ کو ان کے خال معظم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اس دنیا سے رحلت فرمائی تھی۔ حضرت مولانا علی میاں ندوی کو معارف نے اپنی تعزیتی تحریر میں داعی الی اللہ کے الفاظ سے یاد کیا تھا۔ آج یہی الفاظ اپنی پوری معنویت کے ساتھ مولانا رابع ندوی کے لیے بھی دہرائے جا سکتے ہیں اور یہی کیا، ندوۃ العلماء کی نظامت، مسلم پرسنل لا بورڈ، رابطہ ادب اسلامی اور تحریک پیام انسانیت کی صدارت اور ملک کے مقتدر ترین تعلیمی و علمی اور مذہبی اداروں کی رکنیت اور بے شمار مدارس اور تنظیموں کی سرپرستی انہوں نے کی۔ حق ہے کہ یہ تمام ادارے زبان حال سے یہی کہتے ہیں کہ مولانا نے ہندوستان میں سرمایہ ملت کی نگہبانی کا فریضہ پوری امانت سے ادا کیا۔

***

حضرت مولانا علی میاں ندوی کے انتقال کے بعد جب ندوۃ العلماء کی نظامت کی ذمہ داری مولانا کے سپرد کی گئی تو معارف نے لکھا کہ "مولانا سید محمد رابع ندوی اور ندوۃ العلماء لازم و ملزوم ہیں۔ ان کا ذہنی و دماغی سانچہ یہیں تیار ہوا ہے۔ ان کو اس سے عشق ہے اور اس کی محبت ان کے رگ و ریشہ میں پیوست ہے۔ شروع ہی سے وہ مولانا علی میاں کے زیر تربیت رہے اور عرصہ دراز سے ان کی رہنمائی میں ندوہ کے علمی و انتظامی کام انجام دے رہے ہیں، اس لیے یہ انتخاب بالکل مناسب اور بجا ہے اللہ تعالیٰ ان کی قیادت میں ادارے کو مزید ترقی بخشے"۔ خدا جانے یہ دعا کس عالم میں کی گئی کہ قبولیت گویا اس کی منتظر تھی، بائیس تیئیس سال میں ندوہ طلبہ کی کثرت، عمارتوں کی وسعت اور ہر شعبہ میں غیر معمولی ترقی کی

وہ تصویر بن گیا جس کو صرف شاہکار ہی کے لفظ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ جیسی عرب و عجم کی سرمایہ افتخار و نازش ذات کی نیابت قطعی آسان نہیں تھی۔ مولانا رابع صاحب لاکھ ان کے پروردہ اور تربیت یافتہ تھے، لیکن نیابت و خلافت میں عظمتوں کا تسلسل ظاہری اعتبار سے ناممکن سا نظر آنا بے وجہ تو نہیں تھا اور یہ بھی حقیقت اپنی جگہ کہ ملکی اور بین الاقوامی حالات کی گردش اور اس کی رفتار، وقت کی تیز گامی کی شکار جیسی اب ہوئی، پہلے ایسی تو نہ تھی، مسائل پہلے جیسے ہو سکتے تھے، لیکن اب ان کی نوعیت میں فرق آچکا تھا، معاملہ فہمی اور واقعات پر نظر اور ان کی تہہ کے ادراک کے پیمانے بھی پہلے جیسے نہیں رہ گئے۔ ایسے میں فکر کے زاویوں کو نیا رخ دینے اور زبان و بیان کی نزاکتوں پر نظر رکھنے کی ذمہ داری جس طرح ہمارے مولانا رابع ندویؒ نے نبھائی اور نقار خانوں کو انہوں نے جس طرح دیوان خاص میں بدلنے کی حکیمانہ سعی کی اور تندی و تیزی پر آسانی و نرمی کو ترجیح دینے کی کوشش کی، اس سے خود مولانا کو جو مرکزیت اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ شاید آئندہ مسلمانان ہند کی تاریخ کے مطالعہ کا ایک اہم تحقیقی مواد بن جائے۔

***

مولانا کی دور اندیشی اور اصابت رائے کا ایک مظہر ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ میں ان کے پیش کردہ خطبات نظامت کا موضوع و مواد بھی ہے، اسی سال انتقال سے ایک ماہ پہلے انہوں نے اپنے آخری خطبہ نظامت میں بڑے درد سے کہا کہ ہمارے دانشور اور اہل فکر حضرات کی طرف سے امت کے مستقبل کی فکر عام طور پر صرف تمناؤں اور اپنے نیک تصورات سے کی جارہی ہے۔ ان کی فکر و کوشش امت کے صرف مادی طور پر خوش حال مستقبل کے لیے ہورہی ہے۔ دنیا کے موجودہ مادہ پرستانہ ماحول میں اس کے دین و ایمان کو جو سنگین خطرہ درپیش آرہا ہے اس کو ہمارے دانشور اور اہل فکر وہ اہمیت نہیں دے رہے ہیں جو اس کو دینا چاہیے۔ مولانا کے یہ الفاظ گویا ایک صدی کے تجربے کے عکاس تھے کہ دینی اقدار سے عام مسلمانوں کے وابستہ ہونے کے سلسلے میں دینی مدارس سے جو مدد مل سکتی ہو تو مدد لینا چاہیے۔ چہ جائیکہ علوم دینیہ کے ان مدارس کو بھی ان کے دینی تعلیمی نظام سے ہٹانے کی دعوت دی جانے لگے، جیسا کہ کچھ دنوں سے نظر آرہا ہے۔ یہ غالباً مولانا کا اس دنیا میں آخری پیغام تھا جو ایک بڑی آزمائش کی جانب اشارہ کر رہا تھا کہ مدارس دینیہ کو ان کے اصل مقام اور ان کی بنیادی ذمہ داری سے کن کن حیلوں سے انحراف کی راہوں پر ڈالا جارہا ہے۔ وہ اکثر فرماتے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کی کوششیں اپنی جگہ، لیکن حکومت اور عدالت کو موقع تو ہماری ہی مائیں بہنیں اور بیٹیاں دیتی ہیں، یہی کیفیت رابطہ

ادب اسلامی اور تحریک پیام انسانیت جیسے شعبوں کی تھی کہ ملت کی کامرانی کے ساتھ بنی نوع انسان کی نجات اور اصل فلاح کا پیغام عام کیا جاتا رہے۔ مولانا کی بیشتر کتابوں میں بس یہی روح کارفرما نظر آتی ہے، ان کی کتاب رہبر انسانیت، ان کی مقبول ترین کتابوں میں ہے۔ سیرت کی تمام کتابیں ان کے سامنے تھیں جو اپنے اپنے زمانہ کی ضرورت اور حالات کے مطابق تھیں، مولانا موضوع کی اہمیت کے لحاظ سے ہمت نہیں کر پارہے تھے لیکن جب یہ سیرت سامنے آئی تو اپنے آسان اسلوب کی وجہ سے یہ اردو کے سرمایہ سیرت میں بہت مفید اضافہ بن گئی۔ مولانا تقی الدین ندوی کی کتاب محمد رسول اللہ رحمت اللعالمین میں مولانا مرحوم کا مقدمہ ہے، مختصر ہے لیکن سیرت نگاری میں نہایت اہم نکتوں پر مشتمل ہے۔ مثلاً مولانا مرحوم کی نظر میں سیرت و سوانح عام طور پر تاریخی اسلوب میں تیار کی جاتی ہیں، واقعہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کی سیرت اپنے حسن و جمال، موزونیت و لطائف اور اثر انگیزی کے لیے کسی سفارش کی محتاج نہیں، اس میں عقل و جذبات دونوں کے بیک وقت شانہ بہ شانہ کارفرمائی ہونی چاہیے۔ اگر سیرت کی کوئی کتاب اس جذباتی اور ایمانی عنصر سے خالی ہے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ چوب خشک کا مصنوعی ڈھانچہ ہے جس میں زندگی کی حرارت و نمو موجود نہیں لیکن یہ ضروری ہے کہ یہ جذبات عقل سلیم کے تقاضوں پر غالب نہ آئیں۔ اس بنا پر حدیث شریف کے بیان میں جو احتیاط اور واقعات و حالات کی جو مرجعیت ہے اس سے سیرت ایسی معتبر اور واقعیت کی حامل بنتی ہے جو تاریخی انداز بیان میں مشکل ہی سے پایا جاسکتا ہے۔ مولانا کا ایک محبوب موضوع قرآنیات بھی رہا۔ ان کی بیشتر تحریریں قرآنی نکات سے لبریز نظر آتی ہیں۔ مولانا ندوہ کے ادیب اول تھے، ان کے ادب کی سب سے بڑی شناخت ان کا وہ اسلوب ہے جس پر سادگی اور سلاست اور روانی ختم ہے، تحریر ہو یا تقریر مولانا کے پاس آسان اور عام فہم الفاظ کا جیسے ایک خزانہ تھا۔ جس کی مدد سے وہ بھاری بھرکم الفاظ یا انشاپردازی کے بغیر بھی مضمون کو حد درجہ موثر اور دل میں اتر جانے والا بنادیتے تھے۔

***

دارالمصنّفین سے ان کا تعلق کسی رسمی اور اصطلاحی تعبیر سے پرے تھا، وہ مجلس انتظامیہ کے رکن رکین تھے، معارف کی مجلس ادارت میں ان کا نام گویا معارف کا لازمی جزو تھا۔ وہ ندوہ کے ناظم بنے تو پہلے ہی خط میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم کو لکھا کہ ”میں جانتا ہوں اور دیکھتا رہا ہوں کہ دارالمصنّفین کے بقا و ترقی کی حضرت مولانا علی میاں کو کیسی فکر رہتی تھی۔ فرماتے تھے کہ اس کی بہتری کے لیے جو کچھ کیا جاسکتا ہو کرنا چاہیے“۔ اس کو اپنا ادارہ سمجھتے، ان کی یہ دلچسپی دیکھ کر ہم کو بھی فکر ہونے لگتی تھی کہ ہم

کیا کر سکتے ہیں اور ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ دارالمصنّفین کے لیے ان کی یہ فکر آخر تک قائم رہی، مولانا ضیاءالدین اصلاحی سڑک حادثہ میں جب سخت زخمی ہوئے تو وہ رات بھر وقفے وقفے سے فون کرتے رہے اور آخر صبح کو وہ لکھنؤ سے اعظم گڑھ آہی گئے۔ مولانا اصلاحی مرحوم کی نماز جنازہ پڑھائی اور مسجد میں ایک نہایت پر اثر تقریر بھی کی۔ دارالمصنّفین کے سو سالہ جشن میں وہ عوارض کے باوجود شریک ہوئے۔

***

مولانا کی ملی خدمات کا ذکر کیا جاتا رہے گا لیکن ساتھ ہی ایک ایسے انسان سے محرومی کا ذکر بھی ہوتا رہے گا جس کی سرشت میں انسان کامل کی خوبیوں اور صفتوں کا خمیر خون کی طرح شامل رہا۔ مولانا مکارم اخلاق کا وہ نمونہ تھے۔ جو اسلام کا مطلوب و مقصود ہے۔ سادگی، فروتنی، تواضع اور ہر کہہ ومہہ کا پاس ولحاظ اور خندہ جبینی اور ایک عجیب مشفقانہ تبسم ان کی شخصیت کے وہ اجزا تھے جن کا نظارہ اب شاید کم ہی نصیب ہو، اور یہ سب اس وقت بھی جب مصائب اور آزمائشوں سے جینا دشوار ہو جائے، مولانا نے جو صدمے برداشت کیے ان کو کیسے بیان کیا جائے، تھوڑے تھوڑے وقفہ پر بھائی، داماد، نواسے، بھتیجے رخصت ہوتے گئے۔ مولانا کی زندگی میں قریب سے دیکھنے والوں کو صرف ایسے سناٹے دکھائی دیئے جہاں ہوش وحواس کی بھی خبر نہ ہو لیکن مولانا صبر اور رضا بالقضا کی تصویر بن گئے، دوسروں کے درد کی فکر میں اپنے کرب وغم سے بظاہر بے نیاز رہے، شاید یہی وجہ تھی کہ مولانا جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تو لکھنؤ نے ان کو جس شان سے الوداع کہا وہ لکھنؤ کی تاریخ میں بے مثال بن گیا۔ جمعہ کے دن بائیس رمضان کو ایک اور بڑے مجمع نے ان کو تکیہ کی نرم اور خنک خاک کے سپرد کردیا۔ اس مجمع میں دارالمصنّفین کے رفقاء بھی دعائے مغفرت کا آخری نذرانہ پیش کر رہے تھے۔ ناظم دارالمصنّفین ڈاکٹر ظفرالاسلام خاں اور نائب ناظم ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی نے تعزیتی کلمات کے ذریعے اظہار رنج وغم کیا۔

***

مولانا مرحوم کی جانشینی کی ذمہ داری اب مولانا سید بلال عبدالحی حسنی کے سپرد کی گئی ہے۔ ان کی خوش نصیبی ہے کہ سرپرستی کے لیے ندوہ کے اب سب سے زیادہ معمر اور سب کے بزرگ مولانا سعیدالرحمن اعظمی ندوی کا وجود مسعود میسر ہے۔ ان کے لیے وہی جذبات ہیں جو معارف نے برسوں پہلے ظاہر کیے تھے کہ یہ انتخاب بالکل مناسب اور بجا ہے، ان کی قیادت میں ادارے کی ترقی کی دعا دل سے ہے۔

***

مقالات

ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمہ قرآن: ایک تعارف

ڈاکٹر ماجد الاسلام

لکچرار ڈگری کالج برائے خواتین کپوارہ جموں و کشمیر

abmajid456@gmail.com

قرآن پاک تمام انسانوں کے لئے ہدایت کی کتاب ہے۔ جہاں تک دوسری زبانوں میں اس کے ترجمے کا تعلق ہے، دور نبوی میں نہ پورے قرآن کا کسی زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے اور نہ کسی جزوی حصے کا، اس لئے کہ اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔ ترجمہ قرآن کا آغاز عہد صحابہ سے ہو گیا تھا۔ حضرت سلمان فارسی نے فارسی زبان میں سورہ فاتحہ کا ترجمہ اپنے اہل وطن کے لئے کیا تھا۔ قرآن کا باقاعدہ اور سب سے پہلا ترجمہ جو اس وقت دستیاب ہے وہ ابن جریر طبری کی عربی تفسیر کا فارسی ترجمہ ہے جسے امیر المنصور بن نوح کے لئے فارس کے علماء نے کیا تھا۔ اس کے بعد ہر صدی میں تراجم و تفاسیر کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے۔

جزوی اور لسانی ترجمے کی ابتدا زمانۂ رسالت سے ہو چکی تھی کیوں کہ مختلف ملکوں سے جو وفود حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے ان تک اسلام کا پیغام پیش کرنے کا واحد ذریعہ ترجمہ ہی تھا۔ تاریخی اعتبار سے حضرت سلمان فارسی کے سورۂ فاتحہ کے ترجمے کی نشاندہی کی جاسکتی ہے لیکن قرآن کے ترجمے کا باقاعدہ آغاز تیسری صدی ہجری سے شروع ہوتا ہے۔ سب سے پہلے ہندی زبان میں مکمل قرآن کا ترجمہ ہوا۔ ڈاکٹر محمد امین تیسری صدی کے مشہور بزرگ ابن شہریار کے سفر نامے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> کشمیر کے راجا مہروک نے ۲۷۰ ہجری/۸۸۳ء میں منصورہ (سندھ) کے حاکم امیر عبداللہ بن عمر کو لکھا کہ میرے پاس ایک ایسا آدمی بھیج دیا جائے جو اسلامی شریعت کے احکام ہندی زبان میں بیان کر سکے۔ امیر عبداللہ نے ایک مسلمان عالم کو بھیجا جو ہندوستان کی مختلف زبانیں جانتا تھا۔ انہوں نے راجا کے پاس چند سال ٹھہر کر راجا کو پورے اسلام سے واقف بنا دیا۔ راجا نے ان

سے خواہش کی کہ ہندی زبان میں میرے لئے قرآن کی تفسیر کر دے۔ سورہ یسین تک یہ تفسیر مکمل ہو گئی تھی۔[۱]

اس کے بعد بخارا کے سامانی بادشاہ (۲۶۱ھ-۳۸۹ھ) منصور بن نوح سامانی کے عہد میں فارسی زبان میں قرآن کا ترجمہ ہوا، جس کی اشاعت ۱۹۷۰ء میں تہران میں ہوئی۔[۲]

اردو زبان میں ترجمہ قرآن کی روایت

اردو زبان ایک نوزائیدہ زبان ہے۔ مسلمانوں کے دور حکومت میں اردو نہ تو سرکاری زبان تھی اور نہ ہی اس زبان میں تعلیم دی جاتی تھی جس کے نتیجے میں اردو زبان میں علمی کتابوں کے ترجمے کی ابتداء دیر سے ہوئی۔ اردو زبان میں پہلا ترجمہ ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء میں شمالی ہند میں مولانا معظم نابھوی نے کیا۔ یہ ترجمہ نامکمل تھا اور نادر شاہ کے دہلی پر حملے کے نتیجے میں آتش زنی سے ضائع ہو گیا۔ اس کے بعد ''خدائی نعمت'' کے نام سے ۱۱۸۵ء میں شیخ مراد اللہ سنبھلی نے قرآن کا نامکمل ترجمہ و تفسیر لکھی۔ ۱۸۲۰ء میں کلکتہ میں پہلی بار اس کا پارۂ عم شائع ہوا۔ ڈاکٹر سعود عالم قاسمی لکھتے ہیں کہ مراد اللہ سنبھلی مکمل ترجمہ و تفسیر لکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے سورۂ بقرہ اور آخر کے دو پارے مکمل کر لئے تھے۔ ان کے مکمل کرنے کے بعد ان کے شیخ مرزا مظہر جان نے انہیں منع کر دیا۔ اس طرح یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اس کے بعد ۱۱۹۴ھ میں شاہ غلام مرتضٰی جنون الہ آبادی نے پارۂ عم کا منظوم ترجمہ کیا۔ یہ تفسیر ۱۲۹۵ھ میں مطبع طبعی میں تفسیر مرتضوی کے نام سے شائع ہوئی۔ ان تینوں ترجموں کے بعد اردو زبان میں مکمل ترجمہ ۱۲۰۵ھ میں شاہ عبدالقادر اور ان کے بڑے بھائی شاہ رفیع الدین کا منظر عام پر آیا۔[۳]

اردو تراجم قرآن کے تین مختلف تدریجی ادوار

قرآن کا ترجمہ دنیا کی بے شمار زبانوں میں کیا گیا ہے لیکن سب سے زیادہ ترجمہ و تفسیر کا مواد اردو زبان

---

[۱] ڈاکٹر سید محمد امین، شاہ حقانی کا اردو ترجمہ و تفسیر قرآن — ایک تحقیقی و تنقیدی جائزہ، کتب خانہ امجدیہ، دہلی، ۲۰۰۱، ص: ۱۸۷

[۲] ماخذ سابق، ص: ۱۸۸

[۳] سعود عالم قاسمی، منہاج ترجمہ و تفسیر، فاران اکیڈمی، علی گڑھ، ۲۰۰۵، ص: ۲۰

میں موجود ہے۔ اردو چونکہ ایک لشکری زبان کی حیثیت سے سامنے آئی اور اس زبان کو بہت سے ارتقائی مراحل سے گزرنا پڑا، اس لئے جہاں تک اردو تراجم قرآن کا تعلق ہے ان کو ہم ارتقائی مراحل کے لحاظ سے مختلف ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ہر زمانے میں مترجمین کا یہی مقصد رہا ہے کہ ان لوگوں تک قرآن کا پیغام پہنچایا جائے جو عربی زبان سے ناواقف ہیں۔

اردو کا پہلا اور ابتدائی دور، دکنی دور سے شروع ہوتا ہے۔ یہ دور اٹھارویں صدی عیسوی کے اختتام تک رہا۔

دوسرا دور شاہ رفیع الدین کے ترجمہ قرآن سے شروع ہوتا ہے اور یہ انیسویں صدی کے اختتام پر ختم ہوتا ہے۔

تیسرا دور مولوی (ڈپٹی) نذیر احمد کے ترجمہ قرآن سے شروع ہو کر عصر حاضر تک چلا آرہا ہے۔

پہلا دور: اس دور کے تقریباً تمام تراجم نامکمل ہیں۔ حافظ محمد عمر اپنے مضمون "اردو زبان میں ترجمہ قرآن کے ادوار" میں لکھتے ہیں:

> اب تک کی دستیاب تحقیقات کے مطابق پہلے دور میں جو تراجم ملتے ہیں وہ تقریباً سبھی نامکمل ہیں حالانکہ وہ خاصی تعداد میں ہیں۔ اگر مختلف کتب خانوں مثلاً کتب خانہ آصفیہ (حیدرآباد دکن)، کتب خانہ سالار جنگ (حیدرآباد دکن)، کتب خانہ ادارۂ ادبیات (حیدرآباد دکن)، کتب خانہ انجمن ترقی اردو (کراچی)، پرنس میوزم (لندن) اور انڈیا آفس (لندن) کے خطی نسخوں اور مطبوعہ کتب کی فہرستوں کو کھنگالا جائے تو ایسے بہت ترجموں کے حوالے ملتے ہیں۔[۴]

دوسرا دور: اس دور میں مکمل ترجمہ قرآن منظر عام پر آیا۔ اردو زبان ترقی کی منزلیں طے کر رہی تھی اور دکنی اثرات بھی کم ہوتے جارہے تھے۔ اس دور کے ترجموں میں شمالی ہند کے الفاظ اور محاورات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ شاہ رفیع الدین کا مکمل ترجمہ اسی دور کا ہے۔ شاہ رفیع الدین، شاہ ولی اللہ کے تیسرے بیٹے تھے۔ ان کے ترجمہ کرنے کا انداز کچھ مختلف تھا۔ وہ یہ کہ شاہ رفیع الدین بولتے جاتے اور ان کے شاگرد سید نجف علی خان اس کو قلم بند کرتے جاتے تھے۔ یہ ترجمہ لفظی ہے۔ اسی صدی میں شاہ ولی اللہ کے دوسرے بیٹے شاہ عبدالقادر نے ۱۷۹۰ء میں قرآن کا بامحاورہ ترجمہ کیا۔ شاہ عبدالقادر اپنے ترجمے کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

---

[۴] حافظ محمد عمر: http://forum.mohaddis.com

اس بندۂ ناچیز عبدالقادر کے خیال میں آیا کہ جس طرح ہمارے بابا صاحب بہت بڑے حضرت شاہ ولی اللہ، عبدالرحیم کے بیٹے، سب حدیثیں جاننے والے، ہندوستان کے رہنے والے، فارسی زبان میں قرآن کے معنی آسان کر کے لکھتے ہیں، اسی طرح عاجز نے ہندی زبان میں قرآن کے معنی آسان کر کے لکھے ہیں۔ الحمد للہ یہ آرزو ۱۲۰۵ھ بمطابق ۱۷۹۰ء میں حاصل ہوئی۔[۵]

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اردو کو پہلے ہندی اور ہندوی کہا جاتا تھا۔ اسی طرح حکیم محمد اشرف (متوفی ۱۸۰۱ء) نے قرآن کا ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ بادشاہ شاہ عالم کی درخواست پر ہوا۔ اس کی زبان شاہ عبدالقادر کے ترجمے کے مقابلے میں نسبتاً آسان ہے۔ لفظی پابندی میں زیادہ سختی نہیں برتی گئی۔ انیسویں صدی کے اس دور میں بہت سارے ترجمے منظر عام پر آئے جن میں کچھ مکمل اور کچھ جزوی بھی شامل ہیں۔ یہی وہ دور ہے جب فورٹ ولیم کالج میں ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی ایماء پر ایک ترجمہ ہوا جو ان کی خرابی صحت کی بنا پر نامکمل رہا۔ اس ترجمے کو بعد میں اسی کالج کے ایک استاد امانت اللہ شیدا نے مکمل کیا۔ اس کو مکمل کرنے میں میر بہادر علی حسینی اور کاظم علی نے بھی اپنا تعاون پیش کیا۔

تیسرا دور: یہ دور ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمہ قرآن سے شروع ہو کر عصر حاضر تک محیط ہے۔ مولوی نذیر احمد کے ترجمے کے بعد کثیر تعداد میں تراجم قرآن منظر عام پر آئے جن میں مولانا احمد رضا خان، مولانا اشرف علی تھانوی، عاشق الٰہی، فتح محمد جالندھری، مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریابادی، سید ابوالاعلیٰ مودودی وغیرہ اسی دور کے مترجمین میں شامل ہیں۔

شاہ عبدالقادر کا ترجمہ قرآن سو برس سے زیادہ عرصے تک ہندوستان میں معروف رہا۔ انہوں نے عربی الفاظ کا ٹھیٹ ہندی زبان میں ترجمہ کیا۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا زمانے کی تبدیلی اور ترقی نے زبان میں بھی تغیر پیدا کر دیا تو شاہ عبدالقادر کا ترجمہ لوگوں کے لئے سمجھنا آسان نہ رہا، اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ بامحاورہ اور آسان زبان میں ایک ایسا ترجمہ قرآن وجود میں آئے جو لوگوں کے لئے فہم قرآن کو آسان بنائے۔ افتخار احمد صدیقی کے مطابق لوگ بامحاورہ ترجمہ قرآن کے منتظر تھے۔ اس ضرورت کی طرف پہلا قدم مولوی محمد احسان اللہ العباسی نے اٹھایا۔ انہوں نے ترجمہ قرآن کا حصۂ اول جو سورۂ فاتحہ وبقرہ پر مشتمل ہے، اسدی پریس گورکھپور سے شائع کیا۔ یہ پہلا بامحاورہ لیکن نامکمل

---

[۵] ڈاکٹر صالحہ عبدالحکیم، قرآن کے اردو تراجم، شرف الدین الکتبی واولادہ، بمبئی، ۱۹۸۴، ص: ۸۰

ترجمہ ہے۔ چونکہ مولوی نذیر احمد ایک عالم دین، حافظ قرآن، ادیب اور کامیاب مترجم تھے، اس لئے لوگوں نے ان سے قرآن کا ترجمہ کرنے کی فرمائش کی۔ ان لوگوں میں اٹاوہ کے مولوی بشیر احمد خاص طور پر شامل ہیں۔ انہوں نے ۱۸۹۲ء میں دہلی کی کانفرنس میں مولوی نذیر احمد سے قرآن کا ترجمہ کرنے کی پُر زور استدعا کی جس پر مولوی نذیر احمد نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ قرآن کے ترجمے کو اپنا مقصد زندگی بنائیں گے۔ بشیر احمد کے مطابق نذیر احمد اس کام کے لئے اس وقت موزوں ترین آدمی تھے۔ مولوی نذیر احمد کو قرآن سے بہت شغف تھا۔ انہوں نے قرآن کو صرف چھ مہینے میں حفظ کرلیا تھا۔ قرآن کے ساتھ اپنی وابستگی کو وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> میں طالب علمی کے زمانے سے قرآن کا گرویدہ ہوں۔ اس وقت بھی دین داری ہی کے تقاضے سے نہیں، بلکہ زبان عربی کی لذت کی وجہ سے مجھ کو قرآن کے رکوع کے رکوع اور سورتیں زبانی یاد تھیں اور امتحان میں جب کبھی کسی لغت یا محاورے کے لئے استشہاد کی ضرورت پڑتی، مجھے اچھی طرح خیال ہے کہ اکثر مجھ کو قرآن کی سند برمحل یاد آجاتی تھی۔[۶]

معاصر تراجم قرآن کے بارے میں مولوی نذیر احمد کی رائے

مولوی نذیر احمد اس وقت کے موجود تراجم قرآن کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ایسا کوئی بھی شخص بے انصاف اور حق شناس نہیں ہے جو شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے ترجموں پر اعتراض کرے۔ مگر اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے ترجمہ کرتے وقت قرآن کے ادب کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے الفاظ کو آگے پیچھے کرنے کو بھی مناسب نہیں سمجھا۔ اگرچہ مولوی شاہ رفیع الدین کے مقابلے میں مولوی شاہ عبدالقادر نے بامحاورہ ترجمہ کرنے کی کوشش کی، لیکن موجودہ زمانے میں لوگ ان دونوں ترجموں کو پسند نہیں کرتے اور جب پڑھتے بھی ہیں تو پڑھ کر خوش نہیں ہوتے۔ اردو زبان کے جاننے والوں میں سے اکثریت ان لوگوں کی ہے جو ایسے ترجموں سے اکتاہٹ محسوس کرتے ہیں اور ان پڑھوں کی طرح فہم قرآن سے قاصر رہتے ہیں جس کی وجہ سے اصل مقصد فوت ہو رہا ہے۔[۷] ایک طرف معاصر تراجم قرآن کے حوالے سے نذیر احمد کے خیالات یہ تھے دوسری طرف وہ قرآن کا ترجمہ کرنے

---

[۶] حیات النذیر، افتخار عالم بلگرامی، مطبع شمسی پریس دہلی، ۱۹۱۲، ص: ۳۴۸

[۷] نقوش آپ بیتی نمبر، مدیر: محمد طفیل، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۶۴، ص: ۶۴

کو درست نہ سمجھتے تھے:

امام ابو حنیفہؒ نے تو فارسی میں قرآن پڑھنے تک کی اجازت دے دی ہے مگر میرے مذہب میں اس کا ترجمہ تک گناہ ہے کیوں کہ ترجمے میں معجز بیانی آنہیں سکتی۔ اردو فارسی کے ترجمے دیکھے، پھیکے، بدمزہ، بے رونق۔ ان میں اصلی قرآن کی سی چستی اور برجستگی اور متانت اور قوت اور فصاحت اور بلاغت اور تاثیر کا کہیں پتا بھی نہیں اور بجائے اس کے کہ کلام الٰہی کی عظمت ذہن نشین ہو ترجموں سے توبہ توبہ الٹی سخافت ظاہر ہوتی ہے۔ اس میں ترجموں کا کچھ قصور نہیں، بلکہ ترجمہ ہی فی نفسہٖ امر محال ہے۔ دوسری آسمانی کتابوں کے ترجمے کا نتیجہ دیکھ چکے ہیں۔ اگر باب ترجمہ مفتوح ہوا تو قرآن کا بھی وہی انجام ہونا ہے۔ کوئی اس سے اتفاق کرے یا نہ کرے جس دن مسلمان ان لفظوں کو بھولے بھولنے سے میری مراد ہے نہ سمجھنا، بس جان لینا کہ اسلام کی آب وتاب گئی۔[۸]

جب مولوی (ڈپٹی) نذیر احمد کی تصنیف ''مراۃ العروس'' منظر عام پر آگئی تو ان کی شہرت اس طور پر ہونے لگی کہ وہ اردو اچھی لکھتے ہیں۔ اسی اثناء میں ان کے چند دوستوں نے ان سے درخواست کی کہ وہ اردو میں قرآن کا ترجمہ کر کے ایک بڑا کام انجام دیں۔ نذیر احمد بھی اس کام کی ضرورت محسوس کر رہے تھے مگر بقول ان کے کہ ''کلام الٰہی کی عظمت کے لحاظ سے ترجمہ کے لئے قرآن کو چھوتے ہوئے ڈر لگتا تھا''۔

اسی اثنا میں ان کو حدیث کی ایک کتاب ''تیسیر الوصول الی جامع الاصول فی احادیث الرسول''* دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ مصنف نے اس میں صحاح ستہ کی احادیث کو جمع کیا تھا۔ نذیر احمد کو یہ کتاب پسند آئی اور انہوں نے اس کا یہ سوچ کر ترجمہ کرنا شروع کیا کہ اگر اس کتاب کا اچھا ترجمہ کیا جائے تو اس صورت میں صحاح ستہ کے ترجمے کی ضرورت نہیں ہے۔ دوران ترجمہ کتاب التفسیر کے عنوان کے تحت قرآن کی آیات بھی آگئیں جن کا ترجمہ بقول ان کے لوگوں کی منشا اور ضرورت کے مطابق بامحاورہ اور سلیس انداز میں کیا۔ ان آیات کا ترجمہ کر کے وہ اس سوچ میں پڑ گئے کہ یہی آیات قرآن میں بھی ہیں۔ اگر اس کتاب میں ان آیات کا ترجمہ کرنا روح دین کے خلاف نہیں ہے تو پورے قرآن کا ترجمہ کرنا کس طرح

---

[۸] حیات النذیر، ص: ۳۳۷

* تصنیف: ابن الدبیع الشیبانی

روح دین کے خلاف ہے۔ اسی فکر میں ڈوب کر انہوں نے اس کتاب کا ترجمہ موقوف کیا اور قرآن کا ترجمہ کرنا شروع کیا۔[9]

جب انہوں نے ترجمہ شروع کیا تو اس دوران مولوی ابو عبدالرحمن محمد (عالم دین، حدیث و تفسیر کے ماہر اور ادب عربی میں نذیر احمد کے شاگرد) نے شروع سے آخر تک ان کا ساتھ نبھایا۔ نذیر احمد مختلف تراجم و تفاسیر قرآن اور دیگر کتب لغت سے ایک آیت یا ایک جملے کا ترجمہ اخذ کرتے تھے اور اس کے بعد مولوی ابو عبدالرحمن اس کو قلم بند کر دیتے تھے۔ قلم بند کرنے کے بعد دونوں میں بحث ہوتی تھی اور جہاں اختلاف ہوتا تھا وہاں دوبارہ تراجم، تفاسیر اور لغت کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اس کے بعد دونوں پھر ترجمہ پر نظر ثانی کرتے تھے۔ تیسری مرتبہ نظر ثانی کے بعد مولوی ابو عبدالرحمن ترجمہ پڑھ کر سنایا کرتے تھے اور نذیر احمد عبارت کی سلاست اور الفاظ کی نشست کا دھیان رکھتے اور ترجمے کو الفاظ قرآن سے ملاتے۔ اس کے بعد پھر بحث ہوتی۔ اختلاف ہونے کی صورت میں پھر متفق ہوتے تھے۔ اس طرح ترجمہ کرنے کے بعد نظر ثانی کی جاتی تھی اور رفتہ رفتہ یہ ترجمہ مکمل ہوا۔[10] ان کے علاوہ ایک نابینا عالم حافظ عبدالوہاب سورۂ بقرہ اور آل عمران کے کچھ حصے کے ترجمے میں شریک رہے۔ نذیر احمد کا کہنا ہے:

> یہ ترجمہ براہ راست قرآن کا ترجمہ ہے نہ کہ دوسرے ترجموں کی طرح کسی ترجمے کا ترجمہ۔ اس کے مآخذ قرآن کے الفاظ ہیں نہ کسی مفسر یا مترجم کے۔[11]

فتح محمد خان جالندھری نے جب اس ترجمہ قرآن کے بارے میں سنا تو انہوں نے اس کو منگوا کر تنقیدی نظر سے دیکھا اور مفید مشوروں سے نذیر احمد کو نوازا۔ مولوی نذیر احمد لکھتے ہیں:

> اس وقت تک ہم نے ترجمے کی عبارت کی خوبی کے پیچھے اصل مطلب تو نہیں، مگر ترتیب الفاظ کا اور خود الفاظ کا بھی جس قدر خیال کرنا ممکن تھا، نہیں کیا تھا۔ مولوی فتح محمد خان نے ہم کو روکا اور بجا روکا اور ہم نے سارے ترجمے کو پھر تیسری بار دیکھا۔"[12]

---

[9] نقوش آپ بیتی نمبر، ص: ۶۴

[10] حیات النذیر، ص: ۳۴۹

[11] ماخذ سابق

[12] افتخار احمد صدیقی، مولوی نذیر احمد - احوال و آثار، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۱، ص: ۲۶۷

نذیر احمد نے ایمانداری سے اپنے معاونین کا نہ صرف اعتراف کیا بلکہ یہاں تک کہہ گئے:

اگرچہ یہ ترجمہ میرے نام سے شائع کیا جاتا ہے مگر میں نے تو سارا حال پوست کندہ ظاہر کر دیا۔ حقیقت میں یہ ترجمہ مولویوں کی ایک جماعت کا ترجمہ ہے۔[۱۳]

افتخار احمد صدیقی کا ماننا ہے کہ نذیر احمد کا انداز بیان مبالغہ آمیز ہے جس سے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ یہ ترجمہ مولوی ابو محمد عبد الرحمن کا ہے۔ اس ترجمے کا آغاز ۱۸۹۳ء میں ہوا۔ ۱۸۹۵ء میں مکمل ہوا۔ اور ۱۸۹۶ء میں مطبع انصاری دہلی سے شائع ہوا۔ بعض لوگوں نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ چند مقامات کا ترجمہ دیگر تراجم قرآن سے مقابلہ کرکے لوگوں کے سامنے پیش کریں لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ معارضہ ہے اور میرا ارادہ معارضہ کا نہیں ہے۔

خصوصیات ترجمہ، مولوی نذیر احمد کی زبانی

نذیر احمد نے اپنے ترجمہ قرآن کی خصوصیات ان الفاظ میں بیان کی ہیں:

اول تو ہم نے اپنے نزدیک بڑی بات یہ کی کہ پیغمبروں کی نسبت تو تڑاق یا ان کی نسبت مفرد ضمیروں کا استعمال گو وہ خدا ہی کی طرف سے کیوں نہ ہو زبان کے اعتبار سے سامع پر گراں گزرتا تھا۔ ہم نے اس طریقے کار کو بدل کر "انا ارسلناک" کا ترجمہ اور لوگ کرتے ہیں "ہم نے تجھ کو بھیجا" اور ہم نے کیا "ہم نے تم کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا"۔ اسی طرح لفظ "قال" خدا کی طرف بھی منسوب ہے اور بندوں کی طرف بھی اور فرشتوں کی طرف بھی اور شیطان کی طرف بھی۔ غرض جو قائل ہے اس کی نسبت عربی میں قال ہی کہا جائے گا۔ ہم نے مناسب مقام دیکھ کر کہیں فرمایا، کہیں عرض کیا، کہیں دعا کی، ترجمہ کیا۔ دوسرے ہم نے جابجا عبارتیں زیادہ کی ہیں اور امتیاز کے لئے ان کو خطوط ہلالی میں محصور کر دیا ہے مگر ہم نے جو عبارت اپنی طرف سے زیادہ کی، اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ ہم نے ترجمے کو تفسیر بنا دیا ہے۔ کہیں توضیح مطلب کے لئے، کہیں محذوف یا مقدر کے اظہار کے لئے، کہیں تسلسل کلام کے لئے، کہیں کلام سابق ولاحق کا تعلق دکھانے کے لئے اور کہیں تحسین ترجمے کے لئے بھی عبارت بڑھائی

---

[۱۳] ماخذ سابق

جاتی ہے۔اصل غرض یہ رہی ہے کہ ترجمے کا پڑھنے والا قرآن کا نفس مطلب بخوبی سمجھ لے اور جہاں خطوط ہلالی سے بھی کام نہیں نکلا تو ہم نے حاشیے پر فائدے لکھے ہیں۔[۱۴]

ترجمہ قرآن پر بعض ناقدین کی آراء

نذیر احمد کا ترجمہ قرآن سنہ ۱۸۹۶ میں شائع ہوا۔ اس وقت اور بعد میں بھی بہت سے لوگوں نے اپنے اپنے تاثرات اس کے بارے میں بیان کئے۔ان میں مولوی عبدالحق،الطاف حسین حالی، محمد مہدی، علی عباس حسینی، رام بابو سکسینہ، وصل بلگرامی وغیرہ شامل ہیں۔ذیل میں چند ایک کے تاثرات کو نقل کیا جاتا ہے:

مولوی عبدالحق:

اس ترجمے کی تمام خوبیوں کو گنوانا تو میری طاقت سے باہر ہے، لیکن اس سے بڑھ کر اور کیا خوبی ہوگی کہ ہزار ہا مسلمان جو اب تک قرآن پاک کے سمجھنے سے قاصر تھے، اب بلا تکلف قرآن کا مطلب سمجھنے لگے اور خدا کے احکام خود اسی کے کلام کے ذریعے سے جاننے لگے۔اردو ترجمے اس سے پہلے بھی موجود تھے، لیکن ترجمے کیا تھے، الفاظ کے گورکھ دھندے تھے، خاک سمجھ میں نہیں آتے تھے۔قرآن پاک کا یہ پہلا ترجمہ ہے۔اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ علاوہ زبان کی سلاست اور فصاحت کے جہاں تک ممکن ہو اصل عربی کا زور اور اس کی شان قائم رہے۔ مولانا چوں کہ عربی اور اردو کے بے مثل ادیب تھے اور زبان کا خاص ذوق تھا، اس لئے ترجمے میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ہونی چاہئیں۔ مسلسل پڑھتے جائیے، سارے مطلب سمجھ میں آتے جاتے ہیں اور فصاحت اور ادبیت کا لطف ایسا کہ چھوڑنے کو جی نہ چاہے۔[۱۵]

الطاف حسین حالی:

قرآن مجید کی خدمت کے لحاظ سے جو امتیاز انہوں نے ہندوستان کے علمائے اسلام میں حاصل کیا ہے اس کا صحیح اندازہ لوگ اس وقت کر سکیں گے جب ان کی وفات پر ایک معتد بہ زمانہ گزر جائے گا اور

---

[۱۴] حیات النذیر، ص: ۳۵۱

[۱۵] مولوی عبدالحق، مقدمہ حیات النذیر، ص: ۵

معاصرین کا دور ختم ہو کر حسد و بغض کے جذبات فرو ہو جائیں گے۔[۱۶]

مولوی محمد یحییٰ تنہا:

مولانا نے ترجمہ کیا اور خوب کیا۔ زبان کی فصاحت اور سلاست کے علاوہ اصل عربی کا زور اور شان جہاں تک ممکن تھا، مولانا نے قائم رکھنے کی کوشش کی۔ مولانا کی یہ خدمت نہ صرف دینی خدمت ہے بلکہ اردو ادب کی بھی ایک بہت بڑی خدمت ہے۔[۱۷]

ڈاکٹر صالحہ عبدالحکیم:

یہ آزاد ترجمہ ہے۔ اس میں نہ الحاد اور نہ عقائد کا کوئی سقم ہے۔ اگر کوئی قرآنی متن کے بغیر ان کا ترجمہ پڑھے تو ایک مسلسل، باربط اور معنی خیز عبارت معلوم ہوتی ہے۔ ناچیز کے خیال میں یہ کوئی جرم نہیں ہے۔[۱۸]

ڈاکٹر محمود حسن:

ڈپٹی صاحب کے ترجمہ قرآن میں جو چیز نمایاں طور پر جھلکتی ہے وہ الفاظ کا مناسب استعمال ہے۔ جملوں کی بندش، الفاظ کی ترکیب اور دہلی کی ٹکسالی زبان آپ کی خصوصیات ہیں۔ آپ کے ترجمے کی زبان میں نہ کوئی لفظ زیادہ معلوم ہوتا ہے اور نہ کم۔[۱۹]

ترجمہ قرآن پر اعتراضات

مولوی نذیر احمد نے قرآن کا ترجمہ اکیلے نہیں کیا، بلکہ اس کے لئے انھوں نے تین برس تک علماء کی جماعت کے ساتھ کام کیا جس کا اظہار انہوں نے ایک خط بنام نواب سید علی حسن خان بہادر ۸ جنوری ۱۸۹۷ء میں کیا۔ ترجمہ مکمل ہونے کے بعد فتح محمد جالندھری نے بھی اس کو تنقیدی نظر سے دیکھا اور

---

[۱۶] ریویو از الطاف حسین حالی، حیات النذیر، ص: ۱۰

[۱۷] محمد یحییٰ تنہا، سیر المصنفین، ص: ۳۴۲

[۱۸] ڈاکٹر صالحہ عبدالحکیم، قرآن حکیم کے اردو تراجم، ص: ۲۴۴

[۱۹] ڈاکٹر محمود حسن، مقالات محمود (اول)، مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکیڈمی الہ آباد، ۲۰۱۴، ص: ۵۳

مفید مشوروں سے نذیر احمد کو نوازا۔اس کے باوجود جب ترجمہ قرآن چھپ کر سامنے آیا تو اس پر مختلف لوگوں نے تنقید کی، جن میں مولانا اشرف علی تھانوی اور مولوی محمد عبداللہ چھپراوی شامل ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے "ترجمہ اصلاح دہلویہ" اور محمد عبداللہ چھپراوی نے "رفع الغواشی عن وجوہ الترجمۃ والحواشی" جیسے رسالے تصنیف کئے۔ان کے علاوہ مختلف لوگوں نے وقتاً فوقتاً اس پر تنقیدی نگاہ ڈالی جن میں قاری عباس حسین، سید عبداللہ، شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، صالحہ عبدالحکیم، ڈاکٹر محمود حسن، ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی، ڈاکٹر سعود عالم قاسمی، ڈاکٹر سید حمید شطاری وغیرہ شامل ہیں۔ ذیل میں چند ایک کے تنقیدی نقطہ نگاہ کو الگ الگ بیان کیا جائے گا۔

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی:

نذیر احمد نے ہر جگہ رسول اللہ ﷺ کے لئے "پیغمبر صاحب" کا لفظ استعمال کیا ہے۔اگر لوگ ان کے نام سے واقف نہ ہوتے تو غالب گمان ہے کہ لوگ انہیں ہندو یا عیسائی سمجھتے۔اسی طرح قوسین میں جو الفاظ عبارت کا تسلسل قائم رکھنے کے لئے نذیر احمد نے استعمال کئے ہیں، ان کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

> خطوط وحدانی میں مولوی صاحب نے جگہ جگہ جو عبارتیں اور فقرے اپنی طرف سے عبارت کا تسلسل قائم رکھنے کے لئے بڑھائے ہیں ان میں ان کا انجن کہیں کہیں پٹری سے پھسل گیا ہے اور وہ معنی قرآن کریم کی آیت سے ہر گز مستنبط نہیں ہوتے جو مولوی صاحب نے خطوط وحدانی میں لکھے ہیں۔[۲۰]

بعض جگہ ہر حیثیت سے غلط ترجمہ کیا ہے اور کہیں موزون الفاظ نہ ملنے کی صورت میں غیر موزوں الفاظ کا استعمال کیا ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے کہیں کہیں سوقیانہ اور عامیانہ الفاظ کا بھی ذکر کر دیا ہے[۲۱]۔

---

[۲۰] محمد اسماعیل پانی پتی، مولانا نذیر احمد کی مذہبی تصانیف، نقوش لاہور، مارچ ۱۹۵۶، ص: ۴۹

[۲۱] ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی، مقالات محمود، مہار اشٹر اردو اکادمی، الہ آباد، ۲۰۱۴۔

صالحہ عبدالحکیم:

نذیر احمد نے ترجمہ کرتے وقت قرآنی متن کی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا۔یہی وجہ تھی کہ علماء نے ان کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ یہ وہ وقت تھا جب شاہ عبدالقادر کا ترجمہ موجود تھا۔اس میں قرآنی ترتیب کا لحاظ بھی رکھا گیا تھااور وہ بامحاورہ بھی تھا۔جب نذیر احمد نے ترجمہ کیا توانہوں نے ترتیب قرآنی کا خیال نہ کر کے ترجمہ کیا۔ان کے مطابق اس ترجمے کی قابل اعتراض بات یہ ہے کہ اس میں کہیں کہیں دہلی کی ٹھیٹ ٹکسالی زبان اور محاورے استعمال کئے ہیں جو کبھی پڑھنے میں مشکل معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ

اللہ ان کو بناتا ہے اور ان کو ڈھیل دیتا ہے کہ اپنی سرکشی میں پڑے ٹامک ٹوئیاں مارا کریں۔ (البقرہ-۱۵)

ٹامک ٹوئیاں محاورہ ہے۔حاشیہ میں اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں ''یعنی جس طرح اندھا آدمی کسی جگہ سے نکلنے کے لئے اٹکل سے کبھی ادھر جاتا ہے اور کبھی ادھر۔''

ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی:

ترجمۂ قرآن کا بنیادی مقصد فہم قرآن ہوتا ہے جب کہ نذیر احمد نے اپنے ترجمۂ قرآن میں جگہ جگہ محاوروں کا استعمال کیا ہے، جس سے اس کی اثر انگیزی کم ہو جاتی ہے۔ محاورے نثر میں تو حسن پیدا کر سکتے ہیں لیکن ترجمے میں خامی پیدا کر دیتے ہیں، جس سے قرآن کے مفہوم کو سمجھنے میں دشواری پیدا ہوتی ہے اور بعض جگہ مفہوم محدود معنی میں سمٹ آتا ہے۔ جیسے

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ

وہ تمہارے دامن (کی جگہ) ہیں اور تم ان کی چولی (کی جگہ) ہو۔(البقرہ-۱۸۷)

اس میں نذیر احمد نے لباس کا ترجمہ چولی دامن کیا ہے۔ محمود حسن کے مطابق لباس کا جسم کے ساتھ نہ صرف چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے ،بلکہ لباس ''ساتر بھی ہوتا ہے، عیوب کی پردہ پوشی بھی کرتا ہے،راحت پہنچاتا ہے اور زینت بھی دیتا ہے''۔ان کے مطابق نذیر احمد کے ترجمے نے یہ وسعت ختم کر دی ہے۔

ڈاکٹر محمود حسن کا مزید کہنا ہے کہ ترجمہ قرآن میں جہاں وضاحت کی ضرورت تھی وہاں انہوں نے حواشی میں مختصر طور پر اس کی وضاحت کی۔ یہ مختصر تفسیر ہے جس کو حواشی کا نام دیا گیا۔ان حاشیوں

میں بغیر حوالے کے وضاحتیں پیش کی ہیں۔[۲۲]

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ

اور (مسلمانو) کافروں سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فساد (نام و نشان کو باقی) نہ رہے اور دہائی ساری خدا ہی کی ہو۔ (الانفال-۳۹)

اس آیت کے ترجمہ کے حوالے سے محمود حسن نے تبصرہ کیا ہے:

یہاں لفظ ''دین'' کا ترجمہ ڈپٹی صاحب نے ''دہائی'' کیا ہے۔ یہ دین کی بالکل غلط تصویر ہے۔ دین ایک ناقابل تقسیم وحدت اور اپنی وسعت فکر قرآنی میں ناقابل ترجمہ لفظ ہے۔ لفظ 'دہائی' سے دین کی کوئی تصویر نہیں بنتی۔ یہاں یہ ترجمہ گمراہ کن ہے۔[۲۳]

ڈاکٹر محمود حسن لکھتے ہیں کہ سر سید نے مسلمانوں کو براہ راست برٹش سرکار کی وفاداری کا درس دیا جب کہ ڈپٹی نذیر احمد نے برٹش سرکار کے قوانین کا اردو میں ترجمہ کر کے اسلامی قوانین کے متوازی ایک اور حکومت کی ترویج میں مدد دی، جس کا اثر ان کے ترجمہ قرآن پر بھی پڑا۔ وہ مزید لکھتے ہیں:

اگر اس ترجمہ قرآن کا بہ امعان نظر مطالعہ کیا جائے تو اس بات کی نشان دہی ہوتی ہے کہ تحکم اور تشریح کے معاملے میں ان کے یہاں اضطراب نہیں تو وہ وضوح بھی نہیں ہے جو قرآن کے بین السطور میں پنہاں ہے۔[۲۴]

اس کے لئے انہوں نے مثال کے طور پر سورہ بقرہ آیت ۲۰۵ کے لفظ ''تولی'' کو پیش کیا ہے اور ساتھ ہی شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین، مولوی اشرف علی تھانوی اور مولانا ثناءاللہ امر تسری کے ترجموں کو بھی پیش کیا ہے۔ آیت کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

☆ اور جب تمہارے پاس سے لوٹ کر جائے تو ملک کو کھوند مارے، تا کہ اس میں فساد پھیلائے اور کھیتی باڑی اور (آدمیوں اور جانوروں کی) نسل کو تباہ کرے اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ (نذیر احمد)

لفظ ''تولی'' کا ترجمہ یوں ہے:

۔ لوٹ کر جانا (نذیر احمد)

---

[۲۲] مقالات محمود، ص: ۵۷

[۲۳] ماخذ سابق، ص: ۶۴

[۲۴] ماخذ سابق، ص: ۵۹

- اور جب پیٹھ پھیرے (شاہ عبدالقادر)
- اور جب پھر جاتا ہے (مولانا ثناء اللہ)
- اور جب حاکم ہو جاتا ہے (شاہ رفیع الدین)

مندرجہ بالا تقابلی ترجمہ کو پیش کرنے کے بعد وہ ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں:

> یہ تمام تراجم یکساں ہیں لیکن ان تمام علماء کے افکار و خیالات کا فرق دوسری جگہوں سے چلتا ہے جہاں انہوں نے اسلام کے تحکم پر زور ہی نہیں دیا بلکہ اصرار بھی کیا ہے۔اس لئے ہم یہ فرض کرنے میں حق بجانب ہیں کہ ڈپٹی صاحب کا ترجمہ ان کے ذہنی افکار کا عکس ہے جب کہ اوروں کے ترجمے نقطہ احتمال لغوی کی وجہ سے ہے۔[25]

وہ مزید لکھتے ہیں کہ ''تولی'' کا ترجمہ لغوی اور نحوی دونوں کے اعتبار سے درست ہے۔اس لفظ کا ترجمہ یہ بھی ہے ''جب انہیں حکومت مل جاتی ہے''۔

اسی طرح انہوں نے سورہ مائدہ رکوع ۷ کو پیش کیا ہے جس میں تقریباً نو بار لفظ ''حکم'' اور اس کے صیغوں کا استعمال آیا ہے۔ڈاکٹر محمود حسن نے تقابل کے لئے مولانا سید مودودی، مولانا ثناء اللہ امرتسری اور عبداللہ یوسف علی کے ترجموں کو پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ''یہ پورا رکوع تشریح قانون اسلامی اور اس کی الہامی حیثیت کے تعین میں برہان قاطع ہے''۔اس لفظ کا استعمال اسلام کے قانون تعزیرات کے نفاذ کے لئے ہے۔وہ مزید لکھتے ہیں:

> حکم کے معنی مجرد حکم کے بھی ہوتے ہیں اور فیصلہ کرنے کے بھی لیکن فیصلہ کرنا حکم کی ایک مخصوص اور مقید صورت ہے۔اس کے پس منظر میں سید مودودی اور ثناء اللہ امرتسری نے حکم کا ترجمہ فیصلہ کیا ہے اور عبداللہ یوسف علی نے Judgement یا Judge کیا ہے جب کہ نذیر احمد نے لفظ حکم کا ترجمہ حکم کیا ہے حالانکہ اس پورے رکوع میں حکم سے مراد احکام عبادت یا دوسرے اوامر و نواہی نہیں ہیں بلکہ صرف تعزیری فیصلہ ہے۔[26]

ان کا کہنا ہے مولانا اشرف علی تھانوی نے ان آیات کے اس لفظ کا ترجمہ حکم اور فیصلہ دونوں کئے ہیں جس سے مقصد واضح ہو جاتا ہے۔اسی طرح شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین نے اس لفظ کا ترجمہ اگرچہ

---

[25] ماخذ سابق، ص: ۶۰

[26] ماخذ سابق، ص: ۶۳

حکم ہی کیا ہے لیکن انہوں نے حواشی اور تفسیر میں مقصد کی وضاحت کردی ہے جب کہ ڈپٹی صاحب کے یہاں یہ الفاظ اطلاقی شان سے استعمال ہوئے ہیں۔اس سے پورے رکوع کا مقصد نزول مجروح ہوتا ہے۔

ڈاکٹر سعود عالم قاسمی

جب نذیر احمد نے قرآن کا ترجمہ کیا تو اس کی پذیرائی خوب ہوئی۔لوگوں نے اس کو عوامی ترجمے سے تعبیر کیا۔وہ ادیب اور افسانہ نگار بھی تھے لٰہذا اس کے اثرات ان کے ترجمۂ قرآن پر بھی پڑے۔پروفیسر سعود عالم قاسمی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> اپنے ذوق کا استعمال انہوں نے ترجمہ قرآن میں بھی کیا۔ کثرت سے عوامی محاورے، روزمرہ کی بول چال کے فقرے، یہاں تک کہ وہ استعارے بھی استعمال کئے جو شرفاء کے نزدیک غیر سنجیدہ اور معیار سے فروتر تھے۔اس عوامی ذوق کے نتیجے میں بعض مقامات پر قرآنی الفاظ وعبارت کی متانت وثقاہت مجروح ہوئی اور بعض مقامات پر ترجمہ کی صحت برقرار نہ رکھ سکے۔[۲۷]

ذیل میں ایک مثال پیش کی جاتی ہے:

> قَالُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ (یوسف : ۱۷)

اس آیت میں لفظ ''نستبق'' آیا ہے جس کا ترجمہ نذیر احمد نے ''کبڈی'' کیا ہے۔پروفیسر سعود عالم قاسمی نے اس پر یوں تبصرہ کیا ہے:

> کبڈی ایک ہندوستانی کھیل ہے جس کو نستبق کے ترجمے کے طور پر دیا گیا، جب کہ اس کا ترجمہ دوڑ میں مسابقت ہے۔ دوڑ میں آدمی دور نکل جاتا ہے جب کہ کبڈی ایک ہی دائرہ میں ہوتی ہے۔[۲۸]

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> قرآنی لفظ ''نستبق'' میں دوڑنے اور ایک دوسرے سے بڑھ جانے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔جب کہ کبڈی ایک ہی جگہ رہ کر کھیلی جاتی ہے۔ حضرت یوسفؑ کے بھائی کہنا بھی یہی چاہ رہے تھے کہ

---

[۲۷] ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی، منہاج ترجمہ و تفسیر، فاران اکیڈمی علی گڑھ، ۲۰۰۵، ص-۴۴

[۲۸] ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی، ترجمہ قرآن کے اسالیب اور مشکلات، ششماہی علوم القرآن (علی گڑھ)، ۱۹۸۷، جلد ۱۸، ص-۴۳

ہم دوڑ کے مقابلے میں دور نکل گئے اور یوسف سے غافل ہو گئے جس کی بنا پر بھیڑیے نے یوسف کو اکیلا پا کر پھاڑ کھایا۔ اگر وہ یوسف کے قریب ہی کبڈی کھیل رہے ہوتے تو بھیڑیا انہیں نقصان نہ پہنچا سکتا تھا۔[۲۹]

مولانا اشرف علی تھانوی کی تنقید

مولوی نذیر احمد کے ترجمۂ قرآن کے سب سے بڑے ناقد مولانا اشرف علی تھانوی ہیں جنہوں نے ''ترجمہ اصلاح دہلویہ'' کے نام سے ۶۵ صفحات کا ایک رسالہ تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ نذیر احمد کے ترجمۂ قرآن میں مطالب قرآنیہ کہیں متن سے، کہیں حاشیہ سے بدل گئے ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے مترجم قرآن کے لیے کچھ شرائط بیان کیے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:

مترجم قرآن کا عربی زبان سے واقف ہونا ضروری ہے۔

مترجم قرآن کی شرعی اصطلاحوں پر نظر ہو۔

''حدیث کو شیوخ سے حاصل کیا ہو، تاکہ تفسیر کرنے میں مخالفت صاحب وحی باثبات نزول کی لازم نہ آئے۔

مذاہب مجتہدین پر نظر ہو، تاکہ اجماع کی مخالفت نہ کرے۔

علم کلام و تفصیل عقائد اہل سنت جانتا ہو، تاکہ اعتقادیات کی تفسیر میں بدعت سے بچ سکے۔

علمائے محققین معاصرین کی ایک معتد بہ جماعت کی نظر میں مقبول و معتبر ہو۔

اس کے علاوہ انہوں نے مختلف سورتوں کے آیات کے ترجموں کو لے کر بھی تنقید کی ہے۔ چند مثالیں اس طرح ہیں:

فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ (البقرۃ: ۱۹۶)

(اور اگر (راہ میں کہیں) گھر جاؤ تو قربانی (کردو) جیسی کچھ میسر آجائے)۔

مولانا اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں کہ یہ ترجمہ حنفی مسلک کے خلاف ہے۔ ان کے نزدیک قربانی کا حرم میں پہنچنا ضروری ہے۔ یہاں مولانا تھانوی کا موقف درست نہیں ہے کیونکہ قرآن کسی مسلک کا پابند نہیں ہے۔ مسلک تو فروعی اور جزوی چیز ہے۔ اصل تو دین ہے۔ اگر قرآن کا ترجمہ کرتے وقت حنفی یا

---

[۲۹] ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی، ششماہی علوم القرآن (علی گڑھ)، جنوری-جون ۲۰۱۳ء، ص: ۵۴

شافعی مسلک کو دیکھا جائے تو قرآن مختلف مسالک کے لوگوں کے ہاتھوں میں بازیچہ اطفال بن کر رہ جائے گا۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُم بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ (البقرۃ: ۲۲۵)

(تمھاری قسموں میں جو لایعنی قسمیں ہیں ان پر تو خدا تم سے کچھ مواخذہ کرتا نہیں لیکن ان قسموں پر تم سے ضرور مواخذہ کرے گا جو تمھاری دلی ارادے سے ہوں)۔

مولوی نذیر احمد نے حاشیہ میں لایعنی سے وہ قسم مراد لی ہیں جو بغیر قصد وارادے کے تکیہ کلام کے طور پر زبان سے نکل جائیں۔ مولانا تھانوی لغو کی اس تعریف کو حنفی مذہب کے خلاف بیان کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک لغو کی تعریف یہ ہے: ''ماضی پر خلاف واقع بظن صدق قسم کھائے''۔ وہ مزید لکھتے ہیں: ''دعوی نفع رسانی اس ملک والوں کا (جو خطبے سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ حصہ ان میں حنفی ہیں) اس کے خلاف کو مقتضی ہے''۔[۳۰]

سورہ آل عمران آیت ۶۳ کے حاشیے میں ڈپٹی نذیر احمد نے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ نجران کے نصاریٰ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضورؐ نے ان کی یہاں تک خاطر داری کی کہ ان کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا اور وہاں انہوں نے اپنے طریقے پر عبادت کی۔ مولانا تھانوی نے اس بات کو دلیل اور روایت کا محتاج بتایا ہے۔

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (النساء: ۱۰۱)

(اور (مسلمانو!) جب تم (جہاد کے لیے) کہیں کو جاؤ اور تم کو خوف ہو کہ (نماز پڑھنے میں کہیں) کافر تم سے (لڑائی کی) چھیڑ چھاڑ (نہ) کرنے لگیں تو تم پر کچھ گناہ نہیں کہ نماز میں سے (کچھ) گھٹا دیا کرو)۔

مولوی نذیر احمد نے اس آیت کے حاشیے میں لکھا ہے کہ کچھ گھٹا دینے سے چار رکعت کا دو رکعت ہے اور اگر اتنا بھی موقع نہ ملے تو ایک ہی رکعت ادا کرے۔ ایک رکعت کا ادا کرنا ان کے نزدیک حدیث ابن عباس سے ثابت ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ انہوں نے نہ حدیث کا متن پیش کیا ہے اور نہ اس کا حوالہ۔ مولانا اشرف علی تھانوی کے مطابق کوئی بھی مذہب ایک رکعت کا قائل نہیں ہے اور حدیث

---

[۳۰] مولانا اشرف علی تھانوی، ترجمہ اصلاح دہلویہ، ص: ۵

میں اس سے صلوۃ مع الامام مراد ہے کہ وہ ایک ہو گی اور دوسری رکعت علیحدہ پڑھنی ہو گی۔[31]

ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ (الانعام: ۲۳)

(پھر اس سے بڑھ کر ان کی فضیحت کیا ہو گی)۔

مولانا تھانوی لکھتے ہیں کہ فتنہ کا معنی فضیحت لینا محتاج دلیل ہے۔ مفسرین نے اس سے کفر یا کذب مراد لیا ہے۔[32]

فتنہ کا اصل معنی آزمائش ہے۔ معنوی طور پر فضیحت درست ہو سکتا ہے۔ کفر یا کذب مراد لینا خود محتاج دلیل ہے۔

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِيْنَ ۔(الانفال: ۷)

(اور (مسلمانو! یہ وہ وقت تھا) جب خدا تم مسلمانوں سے وعدہ فرماتا تھا کہ (مشرکین مکہ کی ان) دو جماعتوں میں سے (کوئی سی) ایک (بھی تم لڑائی کے لیے اختیار کر لو گے تو وہ) تمھارے ہاتھ آجائے گی اور تم چاہتے تھے کہ جس میں (لڑنے کا) بوتا نہیں وہ تمھارے ہاتھ آجائے اور اللہ کی مرضی یہ تھی کہ اپنے حکم سے (دین) حق کو قائم کرے اور کافروں کی جڑ بنیاد کاٹ ڈالے)۔

مولانا تھانوی نے اس ترجمے پر ان الفاظ میں تنقید کی ہے: ''یہاں مقصود ابہام ہے نہ تخییر، جیسا کہ ترجمہ میں اختیار کیا گیا ہے، کیونکہ اگر تخییر مراد ہوتی تو جس جماعت کو یہ لوگ اختیار کرتے حسب وعدہ وہی ہاتھ آنا چاہیے تھی، ورنہ نعوذ باللہ وعدہ خلافی لازم آتی حالانکہ ان کے اختیار اور خواہش کے خلاف واقع ہو اجس کا خود بعد میں مذکور ہے۔ ابہام میں اشکال لازم نہیں آتا''۔[33]

میرے زیر مطالعہ مولوی نذیر احمد کا جو ترجمہ قرآن ہے وہ چودھواں ایڈیشن ہے جو ۱۳۴۰ھ میں نول کشور پریس لکھنو سے شائع ہوا ہے۔ اس کے کل ۹۶۰ صفحات ہیں۔ ترجمہ قرآن کے آغاز سے پہلے اس کے ۶۵ صفحات ہیں۔ باسٹھ صفحات پر فہرست مضامین آئی ہیں۔ صفحہ ۶۳ پر ''وحی کے محفوظ رہنے کی کیا دلیل ہے'' کے عنوان سے گفتگو کی گئی ہے۔ صفحہ ۶۴ پر رموز او قاف قرآن مجید ہیں۔ صفحہ ۶۵ پر اس ترجمہ کا نام ''حمائل شریف مترجم'' اور مترجم کا نام ''فاضل اجل شمس العلماء آں جناب مولوی

---

[31] ماخذ سابق، ص: ۹

[32] ماخذ سابق، ص: ۱۳

[33] ماخذ سابق، ص: ۱۴

حافظ نذیر احمد خاں صاحب'' درج ہے۔ ترجمۂ قرآن کے آخر پر قرآن مجید کے فرہنگ الفاظ و محاورات پر مشتمل ہیں جن کو نذیر احمد کے بیٹے بشیر الدین احمد نے مرتب کیا ہے۔ باقی چار صفحات پر حضورؐ اور آپؐ کی والدہ صاحبہ آمنہ کا نسب نامہ درج ہے۔ اس کے علاوہ حسب ذیل مختلف عنوانات قائم کر کے مختصراً ان پر روشنی ڈالی ہے: مثلاً پیغمبر آخر الزماں ﷺ کا نسب نامہ اور وہ متفق علیہ کہاں تک ہے اور غیر متفق علیہ کہاں تک ہے، آپؐ کی والدہ کی طرف سے نسب نامہ، آپؐ اپنے والد کے انتقال کے کتنے دنوں بعد پیدا ہوئے، تاریخ وماہ ویوم وسن ولادت باسعادت مرضعہ کا نام، کتنے دن مرضعہ کی تحویل میں رہے، آپ کی والدہ کا کب انتقال ہوا، آپ کی طفلی کیونکر گزری، آپ کا متکفل کون کون اور کتنی کتنی مدت رہا، غار حرا کا مختصر حال، حضرت خدیجہ سے نکاح اور آپ کا سفر شام، آپ کی پیغمبری کے وقت کیا عمر تھی؟ آپ نے مکہ معظمہ سے کب ہجرت کی اور کتنے دن مکہ میں رہے اور تاریخ ویوم وسن وفات۔

یہ ترجمہ بین السطور ہے اور کہیں کہیں حواشی کا بھی اہتمام کیا گیا ہے جن میں کہیں تفسیر بالقرآن، کہیں تفسیر بالحدیث، کہیں لفظوں کی تشریح اور کہیں آیت کی تشریح درج ہے۔ ذیل میں ان کی مثالیں یوں ہیں:

تفسیر بالقرآن:

تفسیر قرآن کا اہم ترین اصول یہ ہے سب سے پہلے قرآنی آیات سے ہی تفسیر و تشریح کی جائے کیونکہ قرآن کریم خود اپنی تفسیر کرتا ہے۔ مولوی نذیر احمد نے اس اصول کو اپنے حواشی میں اچھی طرح برتا ہے۔ چند مثالیں یوں ہیں:

۱۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصَّابِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔(البقرہ: ٦٢)

(بے شک مسلمان اور یہودی اور عیسائی اور صابی ان میں جو لوگ اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان لائے اور اچھے کام کرتے رہے تو ان کو ان (کے کئے) کا اجر ان کے پروردگار کے ہاں ملے گا اور ان پر نہ کسی کا خوف طاری ہوگا اور وہ (کسی طرح) آزردہ خاطر ہوں گے)۔

مولوی نذیر احمد نے آیت بالا کی تفسیر میں نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ (المائدہ:۱۸)، وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ (البقرہ:۸۰) اور وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا (البقرہ:۱۱۱) جیسے آیات

کو پیش کیا ہے۔[۳۴]

۲۔ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (البقرہ: ۱۹۵)

(اور اپنے ہاتھوں اپنے تیئں ہلاکت میں نہ ڈالو)۔

اس آیت کی وضاحت میں انہوں نے سورہ الاسراء آیت ۲۹ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا کو پیش کیا ہے۔[۳۵]

۳۔ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔(الانفال: ۵۵)

(اللہ کے نزدیک بدترین حیوانات وہ لوگ ہیں جو کفر کرتے ہیں تو وہ کسی طرح ایمان لانے والے ہیں نہیں)۔

اس آیت کی تشریح میں وہ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (الاعراف:۱۷۹) کو پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"اس مقام پر کافروں کا جانوروں سے بھی بدتر فرمایا ہے اور ایک جگہ فرمایا ہے وہ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ کہ یہ لوگ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہوئے۔ جانور کو عقل نہیں ہے کہ وہ اس سے کام لے۔ کافروں کو عقل ہے اور پھر اس سے کام نہیں لیتے اور چونکہ کام نہیں لیتے اسی واسطے ایمان نہیں لاتے۔ عقل سے کام لیں تو چار و ناچار ایمان بھی لائیں"۔[۳۶]

۴۔ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلَامٌ (ابراهیم :۲۳)

(وہاں ان کی (ملاقات کے وقت) کی دعا سلام علیک ہوگی)۔

اس آیت کی تشریح میں انہوں نے سورہ یسین کی آیت ۵۸ سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ کو پیش کیا ہے۔[۳۷]

تفسیر بالحدیث

قرآن کے بعد تفسیر کا دوسرا ماخذ حدیث ہے۔ مولوی نذیر احمد نے اپنے ترجمہ قرآن کے حواشی میں

---

[۳۴] مولوی نذیر احمد، ترجمہ قرآن، ص: ۱۶

[۳۵] ماخذ سابق، ص: ۴۰۷

[۳۶] ماخذ سابق، ص: ۲۹۲

[۳۷] ماخذ سابق، ص: ۴۱۲

آیات کی تشریح کرتے ہوئے احادیث سے بھی استفادہ کیا ہے۔اس کی چند مثالیں یوں ہیں:

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ (البقرہ:۱۵۲)

(تو تم ہماری یاد میں لگے رہو کہ ہمارے ہاں بھی تمہارا ذکر خیر ہوتا رہے اور ہمارا شکر کرتے رہو اور ناشکری نہ کرتے رہو)۔

اس آیت کی وضاحت میں یہ انھوں نے یہ حدیث بیان کی ہے کہ فرشتے جب روئے زمین سے واپس جا کر اللہ کے دربار میں حاضر ہوتے ہیں تو اللہ ان سے بندوں کا حال پوچھتے ہیں تو وہ ان خیر کی مجلسوں کا تذکرہ کرتے ہیں اور خدا کی طرف سے اپنے بندوں پر اظہار رحمت ہوتا ہے۔

۱۔ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ۚ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۚ(البقرہ: ۲۳۰)

(اب اگر عورت کو (تیسری بار) طلاق دے دیں تو اس کے بعد جب تک عورت دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرے اس کے لئے حلال نہیں ہو سکتی)۔

مولوی نذیر احمد لکھتے ہیں حدیث کی رو سے عورت کا دوسرے شوہر کے ساتھ ہمبستر ہونا ضروری ہے۔[۳۸]

۳وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا (المائدہ:۳۸)

((مسلمانو) مرد چوری کرے تو اور عورت چوری کرے تو ان کے (اس) کرتوتوں کے بدلے میں (بلاامتیاز) دونوں کے (داہنے) ہاتھ کاٹ ڈالو)۔

نذیر احمد نے قوسین میں دائیں کا لفظ استعمال کیا ہے۔حاشیہ میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ ہم نے حدیث سے لیا ہے۔

۴وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (الاسرا: ۷۹)

(اور رات کے ایک حصے میں (نماز) تہجد بھی پڑھا کرو (اور نمازیں تو فرض ہیں اور یہ) تمہاری (نماز) نفل ہے۔عجب نہیں کہ (اس کی برکت سے) تمہارا پروردگار (قیامت کے دن) تم کو مقام محمود میں پہنچائے)۔

مولوی نذیر احمد لکھتے ہیں کہ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ مقام محمود سے مراد وہ مرتبہ شفاعت ہے جس کا حضور ﷺ سے وعدہ کیا گیا ہے۔جس کی بنیاد پر آپ ﷺ لوگوں کی سفارش کریں گے۔[۳۹]

---

[۳۸] ماخذ سابق، ص: ۵۶

[۳۹] ماخذ سابق، ص: ۴۶۲

مفردات قرآن

مولوی نذیر احمد نے جہاں حواشی میں تفسیر بالقرآن اور تفسیر بالحدیث سے کام لیا ہے، وہیں انھوں نے جگہ جگہ لفظوں کی تشریح کو بھی حواشی میں جگہ دی ہے۔ چند مثالیں اس طرح ہیں:

۱۔ مَّنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضَاعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً(البقرہ: ۲۴۵)

(کوئی ہے جو خدا کو خوش دلی کے ساتھ قرض دے کہ خدا اس کے قرض کو (اس کے لئے) کئی گنا بڑھادے گا)۔

یہاں انھوں نے لفظ قرض اور حسن کی تشریح کی ہے۔ ان کے نزدیک قرض یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے اور چونکہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کا ثواب آخرت میں ملے گا، اس لئے اس کو قرض سے تعبیر کیا گیا ہے جب کہ حسن کے لفظی معنی اچھا اور مرادی معنی خوش دلی کے ہیں اور عرف میں قرض حسن بے سودی قرض کو کہتے ہیں۔[40]

۲۔ وَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ یَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَیٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ(النساء: ۲۵)

(اور تم میں سے جس کو مسلمان بیبیوں سے نکاح کرنے کا مقدور نہ ہو تو خیر لونڈی (ہی سہی) جو (کافروں کی لڑائی میں) تم مسلمانوں کے قبضے میں آجائیں بشرطیکہ ایمان رکھتی ہوں)۔

ڈپٹی نذیر احمد کے مطابق بی بی ہماری زبان میں دو طرح بولا جاتا ہے۔ ایک بیاہتا عورت اور دوسرے عام شریف زادی جو کسی کی لونڈی نہ ہو۔ ان کے نزدیک یہاں اخیر قسم کی بیبیاں مراد ہے۔[41]

۳۔ حُرِّمَتْ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِیْرِ وَمَاۤ اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ(المائدہ: ۳)

(حرام ہوا (جانور) اور لہو اور سور کا گوشت اور جو (جانور) خدا کے سوا کسی اور کے نامزد کیا گیا ہو)۔

آیت میں لفظ ما اھل استعمال ہوا ہے۔ نذیر احمد نے نظم قرآن کو مد نظر رکھتے ہوئے جانور کیا ہے، لیکن ساتھ ہی اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ الفاظ قرآنی عام ہے یعنی جو بھی نذر و نیاز خدا کے سوا دوسروں کے نام پر کی جائے حرام ہے۔

۴۔ قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِیَ فَعَلَیْهَا ؕ وَمَاۤ اَنَا عَلَیْكُمْ بِحَفِیْظٍ (الانعام : ۱۰۴)

---

[40] ماخذ سابق، ص: ۶۲

[41] ماخذ سابق، ص: ۱۲۹

((لوگو) تمہارے پروردگار کی طرف سے دل کی آنکھیں تو تمہارے پاس آچکی ہیں۔ پھر (اب) جو دیکھے (اور سمجھے) تو اس کو (نفع) اس کی ذات کو ہے اور جو (دیدہ ودانستہ) اندھا ہو جائے تو (اس کا وبال بھی) اسی کی جان پر ہے)۔

نذیر احمد نے بصائر کا ترجمہ دل کی آنکھیں کیا ہے اور وضاحت میں دل کی آنکھوں سے مراد آیات قرآنی لی ہے جن کے پڑھنے اور سمجھنے سے اللہ کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

مولوی نذیر احمد نے فقہ، سابق مفسرین، قصص الانبیاء، سابق آسمانی کتابوں سے استفادہ کرنے کے علاوہ سائنسی علوم وافکار اور دلائل سے بھی بحث کی ہے۔ مختصر یہ کہ یہ ترجمہ بہت عمدہ ہے۔ اس وقت تک بڑے بڑے علماء نے اردو میں قرآن کا ترجمہ کیا تھا لیکن جو روانی اور سلاست اور شگفتگی نذیر احمد کے ترجمے میں ہے، وہ کسی اور کے ترجمے میں اس وقت تک نہیں تھی۔ یہ ترجمہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ جہاں ان کو عربی زبان پر کامل عبور تھا۔ وہاں وہ اردو زبان وادب کے بھی ماہر تھے جبھی اتنا عمدہ اور اچھا ترجمہ وہ دنیا کے سامنے پیش کر سکے۔ بلاشبہ یہ قرآن مجید کی عظیم خدمت تھی۔ غرض ان کو قرآن مجید سے نہ صرف والہانہ شغف تھا بلکہ اس کے علوم وفنون پر کامل عبور تھا۔ وہ ترجمہ وتفسیر کے لئے تمام ضروری علوم وفنون اور اوصاف سے متصف تھے۔ ان کا ترجمۂ قرآن اہم ترین ترجموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ انھوں نے چھ جلدوں پر تفسیر لکھنے کا خاکہ مرتب کیا تھا لیکن وہ اس کا ایک ہی حصہ مکمل کر پائے جو عقائد پر مشتمل ہے اور (مطالب القرآن) کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس طرح ہم اس مترجم قرآن کے قلم سے ایک اہم تفسیر سے محروم ہوئے۔

مولانا احمد اللہ شاہ شہید نامور مجاہد آزادی

ڈاکٹر محمد سہیل قاسمی

اسسٹنٹ پروفیسر (سنی دینیات) ویمنز کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

msuhail2@myamu.ac.in

ڈاکٹر لیاقت خان

اسسٹنٹ پروفیسر، ادارہ برائے آن لائن وفاصلاتی تعلیم، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

lkhan1@myamu.ac.in

وطن عزیز ملک ہندوستان پر انگریز کی استعماری حکومت مستحکم ہونے کے بعد ۱۸۵۷ء میں ہندوستان کے خیر اندیش اور غیرت مند جوانوں نے نئے عزم وہمت، حمیتِ ملی اور غیرتِ وطن کا وہ شعلۂ جوالہ بلند کیا جو دہلی اور آگرہ میں چمکا، سرزمین اودھ میں چٹخا اور روہیل کھنڈ میں شعلہ افشاں ہونے کے ساتھ ساتھ اس نے ملک کے اطراف واکناف میں آزادی وطن کی ایک نئی امید جگانے کی کوشش کی۔ آزادی وطن کے اس اہم واقعہ کو بعض مؤرخین نے پہلی جنگ آزادی اور بعض مصنفین نے اس کو غدر سے تعبیر کیا۔ اس جنگ آزادی کے عظیم مجاہدین میں ایک اہم نام مولانا احمد اللہ شاہ فیض آبادی کا ہے۔

نام وسلسلۂ نسب

تاریخِ آزادی کے ہیرو، وطنِ عزیز کے بہادر فرزند، فداء ملک وملت، سلطان فتح علی عرف سلطان ٹیپو (شہید) کے ساتھیوں میں ایک اہم نام سیّد محمد علی کا ہے، جو چنیاپٹن[1] کے نواب تھے۔ ۱۲۰۴ھ مطابق ۱۷۸۷ء میں ان کے گھر احمد علی نامی بچہ پیدا ہوا۔ عرفی نام ضیاء الدین اور خطاب دلاور جنگ پڑا۔ اور یہی بچہ بعد میں احمد اللہ شاہ یا احمد اللہ شاہ فیض آبادی کے نام سے مشہور ہوا۔

نواب احمد علی کا سلسلہ نسب گولکنڈہ کے قطب شاہی خاندان سے بھی ہے۔ ان کے اجداد ایک طرف چنیاپٹن کے رئیس اور نواب تھے تو دوسری طرف اپنے زمانہ کے ولی اور قطب۔[2]

---

[1] شہابی، مفتی انتظام اللہ، ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء، طبع اول، فاروقی پریس دہلی، سن ندارد، ص: ۱۴

تعلیم و تربیت اور طبعی رجحانات

نواب احمد علی اس زمانہ کے رواج کے مطابق علومِ عقلی و نقلی سے فراغت حاصل کرنے کے بعد فنون سپہ گری کے حصول میں مشغول ہو کر ان میں مہارت حاصل کی:

جو مکتب سے ان کو فراغت ملی
بڑھا سوئے شمشیر شوق دلی

بچپن ہی سے ان کا طبعی میلان اوراد و وظائف کی طرف تھا۔ نماز، روزہ اور احکامِ شریعت کے سخت پابند تھے۔ ہر عمل میں سُنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتّباع ضروری سمجھتے تھے۔ والدین سے ٹیپو سلطان کی شہادت اور سلطنت خداداد کی تباہی کا حال سُنا تو حکومت اور مال و دولت سے دل بیزار ہو گیا۔[۳]

سیاحت و بیعت

۱۶/۱۷ سال کی عمر میں سیاحت کا شوق ہوا۔ سب سے پہلے حیدر آباد گئے اور نظام کی فوج میں شامل ہو کر مرہٹوں کے خلاف خوب لڑے، یہیں پر انھوں نے شادی کی مگر جلد ہی زوجہ محترمہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد یورپ کے سفر کا قصد کیا۔ اور لندن جا کر ملکہ وکٹوریہ کے مہمان ہوئے[۴]۔ وہاں سے واپس ہو کر بعض عرب ممالک کا دورہ کیا۔ حج بیت اللہ شریف سے مشرف ہوئے۔ پھر ایران ہو کر چمن کے راستے سے ایک عرصہ کے بعد ہندوستان پہنچے۔ اور بیکانیر کے ''سانبھر'' کے علاقے میں ڈیرے ڈال دیئے[۵]۔

---

[۲] سنہ ۱۶۸۷ میں اورنگ زیب عالمگیر نے ''گولکنڈہ'' پر قبضہ کر کے قطب شاہی خاندان کا خاتمہ کیا۔ آخری بادشاہ ابوالحسن تاناشاہ تھے جو عبداللہ قطب شاہ کے داماد تھے۔ جب اس خاندان میں حکومت نہ رہی تو ابوالحسن کے پوتے ''چنیاپٹن'' جا بسے اور وہاں کے نواب کہلائے۔ اس خاندان کے نامور بزرگ سید جلال الدین عادل تھے۔ (مفتی انتظام اللہ شہابی، ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء، ص: ۱۵)

[۳] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص: ۱۵۔

[۴] ماخذ سابق، ص: ۱۸۔

[۵] ماخذ سابق

سانبھر میں دنیابیزاری، چلہ کشی اور مجاہدہ وریاضت میں بارہ برس گذارنے کے بعد مراحلِ سلوک طے کرنے اور رُوحانی کمالات حاصل کرنے کیلئے جے پور جاکر حضرت قربان علی شاہ کے دست مبارک پر بیعت کی۔ حضرت قربان علی شاہ صاحب نے جس طرح رُوحانی فیوض وکمالات سے مالا مال کیا، اور سماع کی اجازت دی اسی طرح اصلاح صوفیہ اور تنظیمِ مجاہدین کا فرض بھی ان کے ذمہ کردیا۔[۶] یہیں ان کا نام سید احمد علی کے بجائے احمد اللہ شاہ ہوگیا۔ پیر میر قربان علی شاہ کے ایماء پر مولانا احمد اللہ شاہ صاحب نواب وزیر الدولہ[۶] کے پاس ٹونک تشریف لے گئے۔ لیکن ٹونک کی آب وہوا ناموافق لگی تو شاہ صاحب ٹونک سے رُخصت ہوکر گوالیار پہنچے اور شہر کے مشہور بزرگ محراب شاہ قلندر[۷] کی خدمت میں حاضر ہوئے۔۔ دیکھتے ہی بزرگ نے کہا: میاں میں تو تمہارا عرصہ سے منتظر ہوں اور جو امانت بزرگوں سے لئے ہوئے بیٹھا ہوں۔ لگتا ہے اب اس کی سپردگی کا وقت آگیا۔[۸]۔

محراب شاہ سے مولانا احمد اللہ شاہ کی بیعت کا تذکرہ کرتے ہوئے مشہور مؤرخ مولانا محمد میاں لکھتے ہیں:

> مولانا سیّد احمد اللہ شاہ صاحب نے قلندر صاحب کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونا چاہا تو داخلہ کی شرط یہ تھی کہ جہاد کی سوکھی رگوں میں تازہ خون دوڑائیں گے اور وطنِ عزیز کو انگریزوں سے نجات دلائیں گے۔ شاہ صاحب نے بسر وچشم یہ شرط منظور کی اور سلسلۂ قادریہ میں آپ سے بیعت ہوکر خرقۂ خلافت حاصل کرلیا۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ کتنے عرصہ آپ نے گوالیار میں قیام کیا۔ البتہ اس موقعہ پر یہ فراموش نہ ہونا چاہئے کہ تقریباً تیس سال پہلے جب حضرت سیّد احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ جہاد کے لئے روانہ ہوئے تھے تو سب سے پہلے تقریباً دو ہفتہ تک آپ کا

---

[۶] نواب وزیر الدولہ نے حضرت سید احمد شہیدؒ اور مولانا اسمٰعیلؒ صاحب شہید سے تربیت پائی تھی۔ یہ بزرگ سماع کے سخت مخالف تھے۔ پھر نواب صاحب موصوف حضرت مولانا سید نصیر الدین صاحب دہلوی سے بیعت ہوئے تھے۔ مولانا نصیر الدین صاحب بھی حضرت سید صاحب شہید کے تربیت یافتہ اور اُن کے خلفاء میں سے تھے۔

[۷] یہ گوالیار کے ایک رئیس کے یہاں پیادوں میں ملازم تھے۔ رئیس کا نام سردار ستولے تھا (ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء، ص:۹)

[۸] مفتی انتظام اللہ شہابی، ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء، ص:۱۹۔

قیام یہیں رہا تھا۔ پھر راجہ ہندو راؤ اسی ریاست کے مدار المہام تھے جن کے نام سیّد صاحب نے مرکزِ جہاد سے خط لکھ کر اُن کو جنگ آزادی کے لئے اُبھارا تھا۔[9]

دہلی مرکزِ سیاست اور اس کی اس وقت کی حالت

پیر طریقت حضرت محراب علی شاہ کے شرائط بیعت پر عزم و عمل کا وقت آیا تو قدرتی طور پر حضرت مولانا سیّد احمد اللہ شاہ صاحب کی نظر دہلی کی طرف اُٹھی۔ چنانچہ ۱۸۴۶۔۱۸۴۷ء میں دہلی تشریف لائے تاکہ انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا جاسکے۔ مولانا محمد میاں ان کے دہلی تشریف لانے کے وجوہات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(۱) اگرچہ انگریزی اقتدار کا مرکز کلکتہ اور اس کا فورٹ ولیم تھا مگر ہندوستانیوں کی سیاست کا مرکز اب بھی دہلی تھا۔ (۲) یہاں مغل سلاطین کا جانشین موجود تھا جو سیاسی لحاظ سے مفلوج و مجبور ہونے کے باوجود اُن بیشمار ہندوستانیوں کے جذبات پر حکمراں تھا جو مغلِ اعظم ہی کے کسی وارث کو سلطنت و حکومت کا صحیح مستحق سمجھتے تھے۔ (۳) یہی دلّی تھی جس کی ولی اللٰہی تربیت گاہ میں "رُوحِ انقلاب" نے جنم لیا تھا۔ جہاں شاہ عبد العزیز صاحب کی تربیت گاہِ سیاسی میں وطنِ عزیز کو نجات دلانے کی تحریک پروان چڑھی تھی اور اُس نے اپنا دورِ شیر خوار گی پورا کیا تھا۔ جہاں جنگ حریت کے سب سے بڑے علمبردار سید احمد شہید کو پرچم قیادت عطا ہوا تھا۔ جہاں سے چند سال پہلے مولانا نصیر الدین صاحب دہلوی کی زیر سیادت سرفروشانِ حریّت کا آخری قافلہ روانہ ہوا تھا۔ (۴) یہی دلّی تھی جہاں بقول مولانا عبید اللہ سندھی اب بھی ولی اللٰہی تحریک کی وہ مرکزی جماعت موجود تھی جس کی رہنمائی حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب اپنی ہجرت گاہ مکہ معظمہ سے فرمارہے تھے۔

ان وجوہات کی بناء پر مولانا سیّد احمد اللہ شاہ صاحب کا قدم سب سے پہلے دہلی کی سمت اُٹھنا ضروری تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ لیکن اس وقت کی صورتِ حال نے جو نزاکتیں پیدا کردی تھیں، اُن کا احساس مولانا سیّد احمد اللہ شاہ صاحب کو گوالیار میں نہیں ہوسکا یا پوری طرح نہیں ہوسکا۔[10]

وہ دہلی تشریف لائے مگر دہلی کو امید کے برخلاف پاکر بہت مایوسی ہوئی۔ اس وقت دہلی کے حالات

---

[9] ماہنامہ دار العلوم، شمارہ ۱، جلد: ۹۲، محرم الحرام ۱۴۲۹ ہجری مطابق جنوری ۲۰۰۸ء۔

[10] ماخذ سابق۔

بدل چکے تھے۔ جن کا تذکرہ کرتے ہوئے مفتی انتظام اللہ شہابی لکھتے ہیں:

قلعہ معلی کی چار دیواری میں حکمرانی تھی۔ غرض کہ نام نہاد کی بادشاہی تھی مگر مسلم قوم اس پر بھی مگن تھی، ہر ایک ادنی ہو یا اعلیٰ اپنی اپنی دلچسپیوں میں لگا ہوا تھا، شہزادے رنگ رلیوں میں مست تھے، بدکاری بڑھی ہوئی تھی، زمانہ کہاں سے کہاں لے جارہا تھا، اس طرف آنکھ اٹھا کر بھی کوئی دیکھنے والا نہ تھا۔ علماء وصوفیہ کو اپنے نام ونمود وتن آسانی اور شکم پروری سے فرصت نہ تھی[11]

دہلی کا یہ رنگ دیکھ کر شاہ صاحب دنگ رہ گئے۔ پھر بھی شیوخ طریقت اور علماء وصوفیہ سے تبادلہ خیالات کر کے علم بغاوت بلند کرنے کیلئے آمادہ کرنے کی کوشش کی، مگر افسوس کہ کوئی تیار نہ ہوا۔ مفتی صدر الدین آزردہ نے مشورہ دیا کہ آگرہ جا کر اصلاحی تحریک کو کامیاب بنایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اس مشورہ کو قبول کرتے ہوئے آپ نے آگرہ کا رخ کیا۔

وہاں سے غرض شاد وناشاد آپ
ہوئے داخل اکبر آباد آپ

آگرہ میں تشریف آوری

مولانا محمد میاں دیوبندی ان کے آگرہ تشریف لانے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مختصر یہ کہ مختلف مکاتبِ خیال اور مختلف سلسلہ تلمذ کے اور فضلاء یہاں رونق افروز تھے اور آگرہ گلہائے رنگا رنگ کا گلدان بنا ہوا تھا۔ ایک عوامی تحریک کا لالہ زار ایسا ہی گلستان بن سکتا تھا۔ دہلی کے اربابِ بصیرت نے اسی مصلحت سے آگرہ کو منتخب کیا اور حضرت مولانا سیّد احمد اللہ صاحب شہید کی عنانِ توجہّ دہلی سے آگرہ کی طرف منعطف کی۔[12]

حضرت مولانا سیّد احمد اللہ شاہ صاحب کے لئے آگرہ[13] بالکل اجنبی شہر تھا۔ یہاں رہ کر عوام کا اعتماد

---

[11] مفتی انتظام اللہ شہاب، ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء، ص: ۲۰۔

[12] ماہنامہ دارالعلوم، شمارہ ۱، جلد ۹۲، محرم الحرام ۱۴۲۹ ہجری مطابق جنوری ۲۰۰۸ء۔

[13] مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی آگرہ کے قدیم باشندے ہیں۔ ان سے زیادہ آگرہ کے حالات اور ماضی قریب کی تاریخ سے کون واقف ہوسکتا ہے۔ وہ آگرہ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

جاٹوں اور مرہٹوں کے زمانہ میں آگرہ کی حالت بیحد زبوں ہوچکی تھی۔ ا۔ مُلا ولی محمد شاہ کی درس گاہ محلہ بالوگنج میں تھی۔ مولوی شمس الضحیٰ اور مولوی بدر الدّجیٰ اور میر اعظم علی اعظم اسی درسگاہ کے فارغ التحصیل عالم

حاصل کرنا اور تحریک قائم کرنے کیلئے ایک عرصہ کی ضرورت تھی۔ مفتی صدرالدین آزردہ نے دہلی سے ان کو روانہ کرتے ہوئے اس ضرورت کی بھی تکمیل کردی۔ انہوں نے مفتی انعام اللہ خاں بہادر وکیل وکیل سرکار کے نام ایک خط لکھا۔ جس کو لے کر مولانا احمد اللہ شاہ مفتی صاحب[۱۴] کے دولت کدہ پر

تھے۔ ۲۔ مولوی محمد معظم جن کے مکتب میں مرزا غالب نے پڑھا۔ ۳۔ میاں نظیر کا مکتب محلہ مائی تھان میں تھا۔ یہاں ہندوؤں کے چند بچے تعلیم پاتے تھے۔ حکیم غلام قطب الدین خاں باطن (صاحب نغمۂ عندلیب) وخلیفہ گلزار علی اسیر یہ اُن کی درسگاہ کے تعلیم یافتہ تھے۔ ۴۔ مولوی امجد علی اصغر کا مدرسہ محلہ تاج گنج میں تھا۔ یہ تھی کل کائنات اکبر آباد کے درس وتدریس کی۔ گنتی کے چند لوگ پڑھے لکھے تھے قاضی سید باسط علی خاں ہمدانی آگرہ کے قاضی القضاۃ تھے۔ مرہٹوں نے اُن کو معزول کرکے للّو بھٹ کو قاضی القضاۃ بنادیا۔ باسط علی خاں مرافعہ کرنے شاہ عالم ثانی کے پاس دلی پہنچے۔ البتہ مرہٹوں نے کچھ خانقاہوں کو جاگیریں ضرور دیں۔ بہرحال حکمران طبقہ کا اثر یہ تھا کہ مسلمان شعائر اسلامی سے دُور ہٹ گئے تھے۔ نماز روزہ کی طرف سے تغافل برتا جاتا تھا۔ متولیانِ مسجد جامع اکبری نے مسجد کی زیریں دکانیں ہندوؤں کے ہاتھ رہن رکھ دی تھیں۔ جامع مسجد کا مصرف صرف یہ رہ گیا تھا کہ اس کے صحن میں کبوتروں کی قلقلیں کھڑی کی جاتی تھیں اور سوتی رسی بٹنے کے کرگھے لگے ہوئے تھے۔ بیچ کے در میں چند چٹائیاں پڑی رہتی تھیں۔ گنتی کے لوگ نماز پڑھتے تھے۔ جمعہ کی نماز میں بیس پچیس مسلمان شریک ہوتے تھے۔ امیر الامراء ذوالفقار الدولہ نجف خاں کے زمانہ سے البتہ تعزیہ داری کا رواج بڑھ گیا تھا۔ تعزیوں پر عرضیاں (سابقہ حاشیہ) چڑھتیں۔ چڑھاوا صدہا روپیہ کا چڑھتا۔ تعزیہ کا ساتویں اور نویں کی شب میں ''ناف شہر'' کا گشت کرایا جاتا تھا۔ عمائد شہر ہاتھ باندھ کر ساتھ ساتھ تعزیہ کے ساتھ چلتے اور کاندھا دیتے۔ دسویں کی صبح الوداع پڑھی جاتی۔ ہزارہا مسلمان عورت مرد جمع ہوتے تھے حتیٰ کہ مولانا غلام امام شہید الوداع پڑھتے تھے۔ بچوں کو تعزیہ پر رہن رکھا جاتا وغیرہ وغیرہ۔ مسلمانوں میں عام طور سے ہندوانی رسوم کی گرم بازاری تھی۔ دیوالی اور ہولی میں برابر ہندوؤں کے شریک ہوتے۔ اس کیفیت کا پورا نقشہ میاں نظیر نے اپنی نظمیات میں کھینچا ہے۔ اُن کے پوتے سوانگ بھرتے تھے اور شہر کا گشت لگاتے۔ سیتلا کے مندر کے ہندو اور مسلمان ہر دو مجاور اور مہنت چڑھاوے کے برابر کے حصہ دار ہوتے تھے۔ یہی حال کمال خاں کے کنوئیں کا تھا۔ یہ تھی عام حالت مسلمانوں کی۔ صدر نظامت ۱۸۲۵/ میں الہ آباد سے آگرہ آیا تو علماء جو وابستگانِ صدر تھے وہ بھی ساتھ آئے۔ تب یہاں علماء کی صورتیں نظر آنے لگیں۔ پہلے جمعہ میں مولوی سراج الاسلام پیش کار نے نماز جمعہ پڑھائی تو اَسّی (۸۰) آدمی اس میں شریک تھے۔ تمام شہر میں یہ شہرہ تھا کہ عظیم الشان جمعہ ہوا۔ (ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء، مفتی انتظام اللہ شہابی، ص: ۱۲ تا ۱۴)

[۱۴] خان بہادر مفتی انعام اللہ ابن مفتی محمد اسحاق سہروردی ابن مفتی محمد ولی نبیرہ ملاّ وجیہ الدین (یکے از ترتیب

حاضر ہوئے، جو اس وقت اہل علم کا مرکز بنا ہوا تھا۔ یہیں پر مولانا احمد اللہ شاہ سکونت پذیر ہو گئے۔ جس کی وجہ سے یہاں عوام وخواص کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہونے لگا، ان کی مقناطیسی شخصیت نے شہر کے علماء کرام، مفتیان عظام، وکلاء اور ڈاکٹرز حتی کہ ہنود کو بھی جمع کر لیا۔ مفتی انتظام اللہ شہابی اس مقبولیت بین الناس والخواص کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ہر ایک نے شاہ صاحب کو آنکھوں پر جگہ دی۔ مولوی فیض احمد عثمانی بدایونی، ڈاکٹر وزیر خاں اکبر آبادی جیسے لوگ شاہ صاحب کے گرویدہ ہو گئے، قوالی کی محفلیں جمنے لگیں، ذکر وفکر کے حلقے قائم ہونے لگے، مریدین کا جمگھٹا بڑھنے لگا۔ مسلمان تو مسلمان ہنود بھی معتقد ہونے لگے۔ بابو بینی پرشاد الہ آبادی وکیل صدر آپ کا معتقد تھا[۱۵]۔

آگرہ میں شاہ صاحب نے سماع اور وعظ کی محفلیں سجائیں، جلوس نکالے اور تیر وتفنگ کی مشقیں بھی جاری کیں۔ جلوس میں ڈنکا ضرور بجایا جاتا تھا، اس لئے عوام میں وہ ڈنکا شاہ کے نام سے مشہور ہو گئے۔ مولانا محمد میاں لکھتے ہیں:

بہر حال حضرت سیّد احمد اللہ شاہ صاحب کے حلقۂ بیعت وارادت نے وسعت اختیار کی۔ محفلِ سماع خود ایک کشش رکھتی ہے۔ یہاں علم وفضل کے ساتھ قوتِ خطابت کا یہ عالم تھا کہ جہاں

دہندگان فتاویٰ عالمگیری) ۱۲۰۶ھ میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد سے علوم عربی کی تحصیل کی۔ فراغت کے بعد لکھنؤ گئے۔ عرصہ تک نظامت کی تمنا میں رہے۔ ناکامی پر مرشد آباد گئے۔ پھر کلکتہ پہنچے۔ وہاں سر ایڈورڈ کولبرک سے تعلق ہو گیا۔ ان کا لڑکا مسٹر شیر ان اُن سے فارسی پڑھتا تھا۔ کولبرک دلی کے ریزیڈنٹ مقرر ہوئے تو مفتی صاحب اس کے ہمراہ دلّی آئے۔ اُس نے اپنے محکمہ کا سر رشتہ کر دیا۔ عرصہ تک وہاں رہے۔ محکمہ قضا میں بعہدہ وکالت (مفتی) مقرر ہوئے۔ جس زمانہ میں صدر نظامت الہ آباد میں قائم ہوا، محکمہ قضا شکست ہو گیا۔ آپ الہ آباد آئے اور محکمہ صدر میں وکیل مقرر ہوئے۔ صدر آگرہ آیا تو آپ بھی اس کے ہمراہ آگرہ آگئے۔ ۱۲۶۶ھ عہدہ دارانِ صدر پر رشوت کا مقدمہ چلایا گیا، تو آپ کو بھی اس الزام میں معطل کر دیا گیا کہ آپ کے یہاں سے کچھ خطوط برآمد ہوئے تھے۔ اپیل میں آپ بحال کر دیے گئے لیکن آپ اس تعلق سے خاطر برداشتہ ہو چکے تھے۔ بحالی کے بعد آپ نے استعفیٰ دیدیا۔ پھر آپ نواب وزیر الدولہ کے پاس ٹونک چلے گئے۔ وہاں آپ کو بندوبست کا مہتمم بنادیا گیا۔ وہیں سے آپ حضرت مولانا احمد اللہ شاہ صاحب کو امداد پہنچاتے رہے۔ انقلاب ۱۸۵۷/ کے بعد ۲۱/ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ /۱۸۵۸/ کو آپ کا انتقال ہوا۔ (ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء، ص:۲۷ ـ ۲۸)

[۱۵] مفتی انتظام اللہ شہابی، ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء، ص: ۲۲۔

آپ کے وعظ کا اعلان ہوتا، ہندو مسلمانوں کا بے پناہ ہجوم ہو جاتا۔ اب ایک وقت ذکر و شغل اور مراقبہ کا سلسلہ ہوتا، دوسرے وقت محفلِ سماع کی گرمجوشی۔ کبھی عام جلسے ہوتے جن میں دس دس ہزار کا اجتماع ہوتا۔ سُننے والے بے قرار ہو جاتے۔ ہر شخص قربان اور فدا ہونے کا عہد کرتا۔ دوسرے تیسرے روز نمازِ عصر کے بعد قلعہ اکبر آباد کے میدان میں فنِ سپہ گری کی مشق کرائی جاتی۔ خود شاہ صاحب بہترین نشانہ باز تھے۔ تلوار کے ہاتھ بھی بہت جچے تُلے ہوتے تھے۔ آپ کہیں تشریف لے جاتے تو مریدین کا ہجوم ساتھ ساتھ رہتا۔ آگے آگے ڈنکا بجتا۔ اس لئے آپ کو ڈنکے والا پیر یا ڈنکا شاہ کہا جاتا[۱۶]۔

آگرہ سے کانپور اور لکھنؤ

شاہ صاحب بھی آگرہ ہی میں مقیم تھے کہ اودھ میں مولانا امیر علی کی شہادت کا واقعہ پیش آگیا۔ اس کی تفصیلات کا علم ہونے پر انہوں نے فرمایا۔ ''اب ہمارے کام کا وقت آگیا''۔ چنانچہ سب سے پہلے گوالیار جاکر اپنے پیر و مرشد محراب شاہ قلندر سے اودھ جانے کی اجازت طلب کی۔ اجازت ملنے پر لکھنؤ جانے کا قصد کر لیا اور آگرہ پہنچ کر سفر کی تیاری شروع کر دی۔ مریدین کا بھی ایک جم غفیر ساتھ ہولیا۔ اس طرح کہ ہر ایک مرید نے توشہ ساتھ لے لیا تھا اور گھر بار کا معقول انتظام کر دیا تھا۔ ماؤں نے بیٹوں کو اجازت دی تھی، اور بیویاں شوہروں کو رخصت کر رہی تھیں۔ ہر ایک کا دل مگن تھا، کہ مرشد ساتھ ہے تو کوئی خطرہ نہیں ہے۔[۱۷]

شاہ صاحب آگرہ سے روانہ ہو کر پہلے کانپور پہنچے۔ وہاں نانا صاحب تانتیا ٹوپے کے معاون عظیم اللہ خاں وغیرہ سے ملاقاتیں رہیں۔ پھر اُناؤ ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔ گھاس منڈی میں قیام کیا۔ وہیں مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی سے ملاقات ہوئی۔ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی لکھتے ہیں:

> مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی جو خالص سرکاری آدمی تھے اُن دنوں لکھنؤ میں صدر الصدور تھے۔ کچھ دن گذرے تھے کہ مولوی عبد الرزاق صاحب فرنگی محلی کی تائید میں مولانا امیر علی شاہصاحب کے خلاف فتویٰ صادر کر چکے تھے۔ وہ (مولانا خیر آبادی) شاہ صاحب سے ملنے

---

[۱۶] ماہنامہ دار العلوم، شمارہ ۱، جلد ۹۲، محرم الحرام ۱۴۲۹ ہجری مطابق جنوری ۲۰۰۸ء۔

[۱۷] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء، ص: ۳۱۔

آئے۔ شاہ صاحب سے ایسی گفتگو ہوئی کہ گھر جاتے ہی صدر الصدوری سے استعفیٰ دیدیا اور الور چلے گئے اور انگریزوں کے جتنے خیر خواہ تھے، اُتنے ہی دشمن ہو گئے۔[18]

مولانا فضل حق خیر آبادی کے اس ماہیت قلب کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا محمد میاں لکھتے ہیں:

بے شک یہ حضرت شاہ صاحب کی گفتگو اور اُن کی قوتِ ارادی کا اثر ہے کہ حضرت مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی کی زندگی میں انقلاب برپا ہو گیا۔ لیکن یہاں حضرت مولانا صدر الدین صاحب آزردہ کی فرزانگی اور دُور اندیشی کی بھی داد دینی چاہیئے کیونکہ اگر زمامِ قیادت حضرت مولانا اسمٰعیل شہید کے کسی جانشین کے ہاتھ میں ہوتی، اور مرکز دہلی ہوتا تو شاید مولانا خیر آبادی میں یہ انقلاب اب بھی برپا نہ ہوتا۔[19]

حضرت مولانا احمد اللہ شاہ صاحب اہل لکھنؤ میں مقبول اور محبوب ہونے لگے اور باشندگانِ لکھنؤ کی والہانہ وابستگی ان سے روز بروز بڑھنے لگی۔ مگر لکھنؤ کے حالات سازگار نہ تھے، قیام کرنا بھی خطرہ سے خالی نہ تھا، کیونکہ انہیں دنوں بارک پور والی فوج برخواست کی گئی تھی جس کے سپاہی زیادہ تر اودھ کے رہنے والے تھے۔ دوسری طرف واجد علی شاہ کو معزول کرکے گرفتار کرلیا گیا تھا۔ اس لئے شاہ صاحب نے لکھنؤ کا قیام مختصر کرکے فیض آباد کا رخ کیا۔

فیض آباد میں شاہ صاحب کی آمد

فیض آباد پہنچ کر انہوں نے تحریک کو تقویت دینا شروع کیا وعظ و سماع کی محفلیں سجائیں اور امیر علی شاہ کے جذبۂ شہادت کو نمونہ بنا کر انگریزوں سے بغاوت کیلئے فداکاران کی جماعت تیار کرنے میں لگ گئے۔ پرجوش خطابت اور سحر انگیز وعظ کے نتیجہ میں باشندگان فیض آباد میں مجاہدانہ رنگ چڑھ گیا اور ان میں انگریز اور عُمال کمپنی سے انتقام لینے کی آگ بھڑکنے لگی۔ ان کے پاس ہزارہا فداکاران جمع ہو گئے، ان میں ہر کوئی مسلح تھا، ساتھ ہی ان کو جنگی تربیت اور قواعد جنگ کی تعلیم دی جانے لگی۔

۱۶/فروری ۱۸۵۷ء کو شام کے وقت کوتوال نے لیفٹننٹ ٹربن کو ان کی سرائے میں لوگوں کی آمد و رفت کے بارے میں مطلع کیا۔ اگلے ہی دن ۱۷/فروری ۱۸۵۷ء لیفٹننٹ تھامس نے شاہ صاحب کا محاصرہ

---

[18] ماخذ سابق، ص: ۳۲۔

[19] ماہنامہ دار العلوم، شمارہ ۱، جلد ۹۲، محرم الحرام ۱۴۲۹ ہجری مطابق جنوری ۲۰۰۸ء۔

کر لیا اور فوجی تربیت اور مجاہدین کی تنظیم بندی سے روکنا چاہا۔ آخر ش دونوں گروہوں میں تلواریں کھنچ گئیں اور جنگ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ شاہ صاحب زخمی ہو کر بیہوش ہو گئے، اسی بیہوشی کی حالت میں پولیس گرفتار کر کے زندان لے آئی۔ ان کے ہمراہی بھی گرفتار کر لیے گئے۔

وہ شیر ژیاں پھنس گئے دام میں
ہوئے قید اس فتنہ عام میں

تحریکِ انقلاب ۱۸۵۷ء کا آغاز

کرنل لیناکس نے احمد شاہ کو پھانسی کی سزا سنادی تھی۔ لیکن ابھی تک اس سزا پر عمل نہ ہو سکا تھا کہ ۱۰/ مئی ۱۸۵۷ء کی طوفان انگیز تاریخ آئی۔ میرٹھ کی بغاوت کی خبر فیض آباد میں بھی آئی۔ چنانچہ موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے امیر علی شاہ اور احمد اللہ شاہ کے مریدین نے سکندر شاہ کی قیادت میں علم بغاوت بلند کیا اور صوبہ دار دلیپ سنگھ کی رہنمائی میں عوام نے بھی کمپنی برطانیہ کے خلاف ہتھیار اٹھالیے اور ۸، جون ۱۸۵۷ء کو جیل پر حملہ کر کے جیل سے تمام قیدیوں کو رہا کرالیا۔ سب نے مولانا احمد اللہ شاہ کو اپنا رہنما تسلیم کر لیا اور انگریز افسران کو ذاتی اسلحہ اور سامان کے ساتھ فیض آباد سے نکلنے کا حکم صادر کر دیا گیا۔

فیض آباد کے اس انقلابی واقعہ نے پورے اودھ میں انقلاب کی لہر دوڑا دی، انگریز حکومت کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ عوام نے مولانا احمد اللہ شاہ سے فیض آباد کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینے کی التجاء کی، مگر مولانا نے انکار کر دیا۔ اور مان سنگھ کو باگ ڈور سونپ کر ملک سے انگریز کو بے دخل کرنے کیلئے لکھنؤ کی طرف چل پڑے۔

لکھنؤ سے تھوڑے سے فاصلہ پر چنہٹ کے مقام پر انگریز فوج سے ان کا سامنا ہوا، انگریز فوج کو شکست دے کر ان کے سامان جنگ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد انگریز نے بیلی گارد اور مچھلی بازار میں بھی ان سے جنگ کی، مگر دونوں جگہ انگریز کو منہ کی کھانی پڑی۔

ادھر لکھنؤ میں ۵، جولائی کو سید برکات احمد، راجہ لال سنگھ اور شہاب الدین وغیرہ نے اودھ کی مسند پر برجیس قدر کی تخت نشینی کر دی۔ اس وقت جہانگیر بخش صوبہ دار توپ خانہ فیض آباد نے ۲۱ ضرب توپ کی سلامی دی۔ شرف الدولہ محمد ابراہیم علی خاں کو خلعت وزارت عطا ہوئی۔ جرنیلی کا خطاب حسام

الدولہ کو ملا۔[20] مگر کل و جزو کے اختیارات ناصر الدولہ علی محمد خاں عرف مموخاں کے ہاتھ میں تھے۔[21] مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی مرحوم اس زمانہ کے لکھنؤ کی حالت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

جس طرح میرٹھ وغیرہ کے باغی سمٹ کر دہلی میں جمع ہوئے تھے اور ظفر کو ہندوستان کا شہنشاہ بنایا تھا، ویسے ہی الہ آباد اور فیض آباد کے باغی بھی ۱۸۵۷ء میں جوش و خروش کے ساتھ لکھنؤ پہنچے۔ اُن کے آتے ہی یہاں کے بہت سے بے فکرے اُٹھ کھڑے ہوئے اور برجیس قدر کی بادشاہی قائم کردی۔ تھوڑی سی انگریزی فوج اور یہاں کے تمام یورپین عہدہ دارانِ مملکت جو باغیوں کے ہاتھ سے جاں بر ہوسکے ''بیلی گارد'' میں قلعہ بند ہوگئے۔[22]

لکھنؤ پہنچنے پر مولانا احمد اللہ شاہ انگریز جنرل آوٹرم، جنرل ہولاک اور جنرل نیل کی فوجوں سے دسمبر تک برسرپیکار رہے۔ پھر فروری تا اپریل ۱۸۵۸ء تک جنرل اوٹرم، جنرل ہیولاک اور جنرل کیمپ بیل سے سخت خونی معرکہ ہوا، بالآخر ۲۱؍ مارچ ۱۸۵۸ء کو سعادت گنج میں جنگ کا فیصلہ انگریز کے حصہ میں آیا۔ تو

---

[20] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء، ص: ۳۸۔

[21] مموخاں، اصل نام علی محمد خاں، داروغہ دیوان خاص۔ برجیش قدر کو مسند حکومت تک پہنچانے میں ان کی کوشش کو خاص دخل تھا۔ حضرت محل کے خاص معتمد تھے۔ مگر اس عارضی شوکت واقتدار کے دور میں بھی زیادہ خود ستائی اور خویش پروری کی شکایت رفع نہیں ہوئی، بلکہ زیادہ ہوگئی جس کی بناء پر حضرت مولانا احمد اللہ شاہ صاحب کو بار بار مداخلت کرنی پڑی۔ جس کی وجہ سے مموخاں حضرت شاہ صاحب سے بھی برگشتہ ہوگیا تھا۔ حضرت محل کے ساتھ لکھنؤ سے نکلا اور جب حضرت محل اور برجیش قدر نیپال روانہ ہوئے تو یہ بھی اُن کے ہمراہ تھا۔ دونوں ماں بیٹوں کو نیپال کے افسروں نے اپنے یہاں رہنے کی اجازت دی۔ اُن کے لئے بطور مدد معاش ایک ہزار روپیہ ماہانہ جاری کردیا۔ مگر مموخاں کی آشفتہ مزاجی اور تند خوئی اس نازک موقع پر بھی ختم نہ ہوئی۔ اُس نے نیپالی افسروں سے ایسا انداز اختیار کیا کہ انھوں نے مموخاں کو اجازت نہیں دی۔ دوسرے سپاہیوں کی طرح یہ بھی انگریزوں کی گرفت میں آگیا۔ گرفتار ہوا۔ مقدمہ چلا۔ مموخاں نے انگریزوں کی وفاداری کے ثبوت میں بہت سی چٹھیاں بھی جو بالواسطہ یا بلاواسطہ ملی تھیں، پیش کیں۔ بڑے شدومد سے دعویٰ کیا کہ میر واجد علی جس کو کمپنی نے دس لاکھ روپیہ عطا کیا ہے میرا نائب تھا۔ اُس نے جو کچھ انگریزوں کی وفاداری میں کارروائیاں کیں وہ سب میرے مشورہ سے کیں۔ بہر حال ان تمام صفائیوں کا نتیجہ اتنا ہی برآمد ہوا کہ پھانسی کی سزا منسوخ ہوئی۔ چند سال کی قید تجویز کی گئی۔ مگر فرار ہونے کی کوشش کی۔ کوشش ناکام رہی۔ دوبارہ گرفتار ہوا اور انڈمان بھیج دیا گیا۔ تقریباً پانچ سال جزیرہ انڈمان میں گذارے۔ پھر سراوک بھیج دیے گئے اور وہیں انتقال ہوا (قیصر التواریخ جلد دوم، ص ۳۴۰، سید کمال الدین حیدر الحسینی، مطبوعہ: ناہید آفسیٹ پرنٹرز نئی دہلی، اکتوبر ۲۰۰۹ء)۔

[22] شرر، عبدالحلیم، گذشتہ لکھنؤ، مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ، اگست ۱۹۷۴ء، ص ۶۰۔

مولانا احمد اللہ شاہ امید کا دامن تھامے ہوئے خیر آباد چلے گئے، یہاں کچھ دن قیام کرنے کے بعد راجہ نواب علی محمود آباد سے فوجی تعاون لیا اور بیگم حضرت محل کے اشتراک سے لکھنؤ پر دوبارہ قبضہ کرنے کی کوشش کی، جو ناکام رہی۔

جب ملک کے چاروں طرف کاسہ لیسوں کی پوری جماعت تیار ہو چکی تھی جو انگریز تاجروں کے یہاں دست گدائی پھیلانے کیلئے حاضری دینے لگے تھے، ایسے حالات میں مولانا احمد اللہ شاہ انقلابیوں کی کمان سنبھالے ہوئے شاہ جہاں پور پہنچ گئے۔

ہنگامہ شاہجہاں پور

یہاں کے ہنگامہ میں حفاظتی فوج مولانا احمد اللہ شاہ کے زیر کمان تھی، اس ہنگامہ میں انگریزوں کو محصور ہونے پر مجبور کر دیا گیا، لیکن جب سر کالن کیمبل بریلی سے ایک بڑی فوج لے کر آیا تو یہ دیکھ کر کہ ہمراہیوں کی تعداد بہت کم ہے اور مقابل کی فوج مع سامان حرب بہت زیادہ، اس لیے خطرے میں پڑنے سے بہتر ہے کہ یہاں سے کوچ کر لیا جائے۔ چنانچہ شاہ صاحب اپنے ہمراہیوں سمیت قصبہ محمدی تشریف لے گئے۔

قصبہ محمدی میں مولانا احمد اللہ شاہ نے ایک علیحدہ حکومت قائم کر لی اور اپنا سکہ بھی ڈھال لیا۔ اس حکومت کے وزیر جنگ جنرل بخت خاں، قاضی القضاۃ سرفراز علی جونپوری، دیوان پیشوا نانا راؤ بنائے گئے۔ اور کونسل کے اراکین میں مولوی لیاقت علی الہ آبادی، ڈاکٹر وزیر خاں اکبر آبادی،، مولوی فیض احمد بدایونی، اور شاہزادہ فیروز شاہ شریک ہوئے۔[۲۳]

اس حکومت کو چھ مہینے ہوئے تھے کہ سر کالن کمبل نے قصبہ محمدی پر حملہ بول دیا۔ سخت خونریز جنگ کے بعد شاہزادہ فیروز شاہ سے اختلاف کی وجہ سے شاہ صاحب کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اور سب نے ایک ایک کر کے قصبہ محمدی چھوڑ دیا لیکن شاہ صاحب کے حوصلوں نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

اب انگریزوں کے خلاف ایک نیا محاذ کھولنے کے لئے ان کی نگاہ انتخاب پوایاں کے راجہ جگن ناتھ پر پڑی۔ انہوں نے سوچا کہ راجہ جگن ناتھ سے مدد لے کر ایک نیا محاذ کھولا جا سکتا ہے۔ چنانچہ راجہ سے

---

[۲۳] سید کمال الدین حیدر الحسینی، قیصر التواریخ، سید کمال الدین حیدر الحسینی، مطبوعہ: ناہید آفسیٹ پرنٹرز نئی دہلی، اکتوبر ۲۰۰۹ء، ۲/۴۳۰۔

گفت وشنید کیلئے ۵، جون ۱۸۵۸ء کو ہاتھی پر سوار ہو کر قلعہ پہنچے، تو خلاف امید استقبال کے بجائے قلعہ کا دروازہ مقفل پایا کیونکہ پچاس ہزار روپیہ کے عوض راجہ کی نیت بدل چکی تھی، وہ انگریز سے اس عظیم مجاہد کا سودا کر چکا تھا، اس کا بھائی بلدیو سنگھ سپاہیوں کے ہمراہ قلعہ کی فصیل پر موجود تھا۔ وہاں کا ماحول دیکھ کر مولانا احمد اللہ شاہ کو ناگوار حالات کا اندازہ ہو گیا، چنانچہ آپ نے قلعہ کا دروازہ توڑنے کا حکم دیدیا۔ اس سے پہلے کہ دروازہ توڑا جاتا راجہ کے اشارے پر اس کے بھائی بلدیو سنگھ نے گولی مار کر مولانا کو شہید کر دیا۔ وہ عظیم مجاہد جس کے سامنے انگریز کے توپ اور بندوق کے گولے بے اثر ہو جاتے تھے اس کو ایک غدار وطن شہید کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی کا بیان ہے کہ:

> راجہ بلدیو سنگھ نے سر مبارک جسم اطہر سے اُتارا، اور صاحب کلکٹر بہادر شاہ جہانپور کے سامنے پیش کر دیا جو عرصہ تک کوتوالی پر لٹکا رہا۔ نعش کو آگ میں پھونک دیا۔ اس پر سرکار برطانیہ نے پچاس ہزار روپیہ نقد اور خلعتِ فاخرہ راجہ پوائیں کو عطا کیا۔ یہ واقعۂ شہادت ۵/جون ۱۸۵۸/ مطابق ۱۳/ذی قعدہ ۱۲۷۵ھ کو پیش آیا۔ دریا پار محلہ جہاں آباد متصل احمد پور مسجد کے پہلو میں سر دفن کر دیا گیا۔ مولوی سیّد طفیل احمد صاحب (مصنف روشن مستقبل و حکومت خود اختیاری) نے کتبۂ تاریخ نصب کرا دیا۔"[۲۴]

شاہ صاحب کی جواں مردی، عزم وہمت اور بہادری کے معترف نہ صرف اہل وطن بلکہ انگریز بھی ہوئے۔ چارلس نال حلیہ بیان کرنے کے بعد لکھتا ہے:

> اودھ کے باغیوں کی تجاویز اور سازش کی تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس مولوی کو انگریزی حکام بحیثیت احمد شاہ فقیر اور صوفی عرصے سے جانتے تھے۔ شمال مغربی صوبجات میں ظاہرًا مذہبی تبلیغ کی خاطر دورہ کر چکے تھے۔ لیکن فرنگیوں کے لئے یہ راز ہی رہا۔ اپنے سفر کے دوران وہ ایک عرصے تک آگرہ میں مقیم رہے۔ حیرت انگیز اثر شہر کے مسلم باشندوں پر تھا۔ شہر کے مجسٹریٹ ان کی جملہ نقل وحرکت پر نظر رکھتے تھے۔ عرصہ بعد یقین ہو گیا، کہ وہ برطانوی حکومت کے خلاف ایک سازش کر رہے ہیں لیکن پھر بھی اُن کو کسی باغیانہ جرم میں ملوث نہ پایا گیا اور وہ آزاد رہے۔ آخر کار جب "بغاوت" رونما ہوئی اور فیض آباد کے فوجیوں میں بھی یہ لوگ پہنچے تو یہ مولوی جو سابقاً غیر منظم طریقے پر اپنے مریدوں کو اُبھار رہا تھا، گارڈ کی نگرانی میں تھا۔ ہنگامہ کرنے والوں نے اُن کو چھڑا کر اپنا سردار بنا لیا۔ اس طرح مولوی صاحب ایک طاقت

---

[۲۴] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء، ص: ۴۹۔

ور فوج کے سپہ سالار بن گئے۔ اگرچہ کچھ عرصہ تک دوسرے باغی سرداروں کی طاقت چھپی رہی لیکن اس شخص کا اثر باغیوں پر بھرپور تھا لیکن یہ قابل آدمی تھا، اور ظلم کے دھبے سے پاک تھا جو ناناصاحب کے انتقامی جوش کی خصوصیت تھی، اس سے یہ بالکل پاک صاف تھا۔ اس لئے برطانیہ بھی ایک حد تک ان کو اچھا اور قابل نفرت نہیں سمجھتی تھی۔[25]

جرنیل تھامس ہنگامۂ ۱۸۵۷ میں شریک تھا، شاہ صاحب کی بابت لکھتا ہے:

مولوی احمد اللہ شاہ بڑی لیاقت و قابلیت رکھتا تھا۔ وہ ایسا شجاع تھا کہ خوف اُس کے نزدیک نہیں آتا تھا۔ یہ عزم کا پکا، ارادہ کا مستقل تھا۔ باغیوں میں اس سے بہتر کوئی سپاہی نہیں تھا۔ یہ فخر اسی کو حاصل ہے کہ اُس نے دو مرتبہ سر کالن کیمبل کو میدانِ جنگ میں ناکام رکھا۔ وہ بہ نسبت اور باغیوں کے خطاب شاہ کا زیادہ مستحق تھا۔ اگر محب وطن ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اپنے ملک کی آزادی کے لئے جو غلطی برپا ہو گئی ہو، سازشیں کی جائیں اور لڑائیاں لڑی جائیں، تو مولوی یقیناً اپنے ملک کا محب صادق تھا۔ اُس نے کبھی تلوار کو مخفی اور سازشی قتل سے خون آلود نہیں کیا وہ بہادرانہ اور معجزانہ طور پر ان سے معرکہ آرا ہوا جنھوں نے اُس کا ملک چھین لیا تھا۔ دنیا کی ساری قومیں اس کو تعظیم وادب کے ساتھ جو شجاعت و صداقت کے لئے لازمی تھیں اور جن کا مستحق تھا، اس کو یاد کریں گی۔[26]

فارسٹر کا ایک اور نذرانۂ عقیدت ملاحظہ فرمایئے:

جن کو فیض آبادی مولوی کہا جاتا ہے، اُن کے متعلق یہ بتادینا ضروری ہے کہ وہ عالم با عمل ہونے کی وجہ سے مولوی تھا۔ رُوحانی طاقت کی وجہ سے صوفی اور جنگی مہارت کی وجہ سے سپاہی اور سپہ سالار تھا۔ اس کی طبیعت ظلم سے پاک تھی۔ ہر انگریز اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔[27]

نہ شیشہ، نہ مے، نہ ساقی رہا
فقط شکوۂ بخت باقی رہا

---

[25] Colonel G.B.Malleson, *The Indian Mutiny of 1857*, London Seeley and Co. Limited Essex Street Strand, 1891, p. 17

[26] *Ibid.*

[27] *Ibid.*

برادرانِ شبلی[1]

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

azmi408@gmail.com

علامہ شبلی نعمانی چار بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ دوسرے مہدی حسن بیرسٹر، تیسرے محمد اسحاق وکیل ہائی کورٹ الہ آباد اور چوتھے محمد جنید نعمانی سب جج کان پور سب سے چھوٹے تھے۔ علامہ شبلی نعمانی فضل و کمال کے نیر تاباں تھے۔ ان کی عظمت و شہرت پوری دنیا میں پھیلی لیکن برادران شبلی کو وہ شہرت نصیب نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔ حتی کہ سلیقے سے ان کا تذکرہ بھی سپرد قلم نہیں کیا گیا۔ بیرسٹر، جج اور برادر شبلی ہونے کے باوجود ان کے کسی بھائی کی تاریخ پیدائش نہیں معلوم۔ اور نہ اب ان کے حالات و کمالات کا کوئی ذکر کرنے والا موجود ہے۔ ناچیز نے اس سلسلہ میں نہایت تلاش و تفحص سے برادران شبلی کی سوانح زندگی کا ایک مرقع تیار کیا ہے اور اس غرض سے شائع کیا جارہا ہے کہ ممکن ہے آئندہ کوئی اس میں اضافہ کر سکے۔

مہدی حسن بیرسٹر: محمد مہدی حسن بیرسٹر (م:۲۹، جون ۱۸۹۷ء) نہ صرف خانوادہ شبلی، بندول گاؤں بلکہ ضلع اعظم گڑھ کے ممتاز اشخاص میں ایک اہم نام ہے۔ وہ علامہ شبلی کے چھوٹے بھائی تھے اور اس خطۂ اعظم گڑھ کے پہلے بیرسٹر ایٹ لا بھی۔

علامہ شبلی کی مذہبی تعلیم و تربیت کے بعد ان کے والد شیخ حبیب اللہ، سر سید سے تعلقات اور ان کی تحریک علی گڑھ کے زیر اثر جدید تعلیم کی طرف راغب ہوگئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خطۂ اعظم گڑھ میں ۱۸۷۴ء میں انہوں نے جس دینی درس گاہ کی بنیاد رکھی تھی اور جس میں مولانا فاروق چریاکوٹی وغیرہ مدرس اول رہ چکے تھے اس کا وجود مٹ گیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے دوسرے بیٹوں محمد مہدی حسن، محمد اسحاق اور محمد جنید کو انگریزی تعلیم دلائی۔

محمد مہدی حسن ان کے دوسرے بیٹے تھے۔ ان کی تاریخ پیدائش معلوم نہیں۔ ان کی تعلیم کا آغاز بھی مذہبی نہج پر ہوا تھا۔ انہوں نے پہلے عربی و فارسی پڑھی پھر قرآن مجید حفظ کیا۔ اس کے بعد ان کی

---

[1] یہ مضمون ''بیان شبلی'' کے حصہ سوم کا حصہ ہے جس کی طباعت جلد ہونے والی ہے۔ جدت اور اہمیت کی وجہ سے اس کو معارف میں شائع کیا جارہا ہے (مدیر)۔

انگریزی تعلیم کا آغاز ہوا۔ابتدائی انگریزی تعلیم انہوں نے اعظم گڑھ کے کس اسکول میں حاصل کی اس کی تفصیل نہیں ملتی۔البتہ۱۸۷۹ء میں وہ علامہ شبلی کے ساتھ وکالت کے امتحان میں شریک ہوکر کامیاب ہوئے۔اس کے بعد وہ ایم،اے،او کالج علی گڑھ میں داخل کئے گئے۔یہاں سے انہوں نے ۱۸۸۱ء میں انٹرنس اور ۱۸۸۴ء میں ایف،اے پاس کیا۔یہ ایم،اے،او،کالج کے بالکل ابتدائی زمانے کے طالب علم تھے۔اس وقت ان کے بڑے بھائی علامہ شبلی نعمانی علی گڑھ میں عربی وفارسی کے نئے نئے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے تھے۔ان کے کامیاب ہونے کی خوش خبری دیتے ہوئے انہوں نے اپنے خانوادے کے ایک شخص فرحت احمد کو لکھا:

مبارک، سپاس ایزد کہ برادر شما عزیزی مہدی حسن در ایف۔اے کامیاب نشست اے خوش آنکہ علی گڑھ رسم تو از پیش رسیدہ باشی وچوں از آمد نم آگہی اندوز شوی دوان سوئے من آئی واز جوش طرب حرف مبارک باد، برلبت گرہ گردد، لبے بہ تبسم واکنی وبآواز گوئی کہ برادر مہدی حسن فال ظفر بنام خود یافت وپس ازاں دو سہ گامے تیز تر آئی وبمن درآویزی وگوئی کہ ہلہ! ہاں! شیرینی کجاست ومن گویم کہ در لب تو، باز انجمنے از یاران فراہم آید وہر یک گفتگو باز کند وگپے زند یارب ہمچنیں باد، بار دیگر مبارک باد۔ایں نامہ رانزد خود نگاہ باید داشت کمترین ہوا خواہان

شبلی نعمانی

۲۳ ؍جون ۱۸۸۴ء

(مبارک ہو۔خدا کا شکر ہے کہ تمہارا چھوٹا بھائی مہدی حسن ایف اے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ جیسے ہی میں علی گڑھ پہنچتا، تم وہاں پہنچ چکے ہوتے۔میری آمد کی خبر سنتے ہی دوڑے چلے آتے۔خوشی کے مارے تمہارے منہ سے بات نہ نکل رہی ہوتی۔تمہارے دل کی حالت تمہارے تبسم سے ظاہر ہو رہی ہوتی اور پھر بے ساختہ تمہارے منہ سے نکلتا کہ بھائی مہدی حسن پاس ہو گیا۔تم تیزی سے دو تین قدم آگے بڑھتے اور میرے سینے سے لگ جاتے اور پوچھتے کہ ہاں، (مہدی کے) پاس ہونے پر میری مٹھائی کہاں ہے؟ میں کہتا کہ تمہارے ہونٹوں پر۔پھر دوستوں کی محفل آراستہ ہوتی اور خوب گپ شپ ہوتی۔خدایا! ایسا ہی ہو۔ایک بار پھر مبارک باد۔ایک بار پھر مبارک باد)۔[۲]

---

[۲] سید سلیمان ندوی۔مکاتیب شبلی، دارالمصنفین، اعظم گڈھ، ۲۰۱۲ء، جلد دوم، ص: ۲۲۵

اس کے بعد اپریل ۱۸۸۵ء میں مہدی حسن نے بارایٹ لا پڑھائی کے لئے لندن کا رخ کیا۔ یہ خطۂ اعظم گڑھ کا شاید پہلا واقعہ تھا کہ کوئی شخص اعلیٰ تعلیم کے لئے بیرون ملک جائے۔ چنانچہ اس خوشی کے موقع پر ان کے والد شیخ حبیب اللہ وکیل نے اعظم گڑھ میں ایک تقریب منعقد کی جس میں معززین شہر اور رؤسائے اعظم گڑھ نے شرکت کی۔ علامہ شبلی علی گڑھ سے آکر اس تقریب میں شریک ہوئے اور ایک دعائیہ نظم پیش کی جس کا آخری مصرعہ یہ تھا:

بہ سلامت روی وباز آئی

علامہ اقبال احمد خاں سہیل (م: ۱۹۵۵ء) کو، جو بے مثال قوتِ حافظہ کے مالک تھے، اس نظم کے دو اشعار یاد رہ گئے تھے:

خار در دیدۂ وعدہ شکنی حاسداں را جگر گداز آئی
ما بہ نادیدہ دور ہست باشیم کہ تو ناگہ زدر فراز آئی

محمد مہدی حسن لندن میں ساڑھے تین سال زیر تعلیم رہے۔ اور وہاں سے پہلے بار ایٹ لا پھر کیمبرج سے بی۔ اے۔ کیا۔ انہوں نے ایک خط میں اپنے تعلیمی عزائم کا ذکر اس طرح کیا ہے:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

میرا منشا محض بارسٹری کی سند حاصل کرنے کا نہیں ہے بلکہ پورے طور پر مقنن اور قانون داں ہونا ہے۔ کیمبرج کا امتحان البتہ مشکل ہے اور وہاں قانون کی ڈگری میں آنرز لینا آسان نہیں ہے۔ مگر اللہ سے امید ہے کہ مجھ کو کیمبرج کا بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی دونوں ملے گا۔ بعد ازاں مجھ کو تین برس میں ہندوستان میں بیٹھے بیٹھے ایم۔ اے اور ایل۔ ایل۔ ایم۔ کی ڈگری مل جائے گی۔ اور اس کے پانچ برس بعد انشاء اللہ ایل۔ ایل۔ ڈی ہو جاؤں گا اور ڈاکٹر (یعنی حکیم علوم) کا خطاب ملے گا۔ ولایت میں ایم۔ اے وغیرہ کا امتحان نہیں ہوتا بلکہ ہر شخص جو بی۔ اے ہوتا ہے تین سال کے بعد ایم۔ اے ہو جاتا ہے [۳]۔

مہدی حسن کا یہ تعلیمی سفر کسی وظیفے کے تحت نہیں بلکہ یہ شیخ حبیب اللہ کی عالی حوصلگی کا نتیجہ تھا۔ چنانچہ اس سفر کے تمام اخراجات انہوں نے خود برداشت کئے یہاں تک کہ مقروض ہو گئے۔ مہدی حسن کو ان تمام باتوں کا احساس تھا۔ ایک خط میں لکھا ہے:

اے میرے باپ!

---

[۳] محمد الیاس الاعظمی، علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط مکتبہ جمال لاہور، ۲۰۱۵ء ص ۱۹۶۔۱۹۷

میری بڑی تمنا یہ ہے کہ خدائے پاک مجھ کو اس قابل کر دے کہ میں آپ کو مکروہات زمانہ کی تکالیف سے سبکدوش کر سکوں۔ میرے لئے عید کا دن وہ ہوگا جب میں آپ کو فارغ البال دیکھوں گا اور جب اس قابل ہوں گا کہ آپ سے یہ کہہ سکوں کہ ''اے میرے پیارے باپ اب آپ کام نہ کیجئے۔آپ کا بیٹا مہدی سب کچھ کرے گا،اب آرام کیجئے۔''......والد صاحب علاوہ اس مہر پدری کے جو باپ کو بیٹے کی طرف ہمیشہ ہوتی ہے،آپ نے میرے ساتھ ایک خاص محبت رکھی ہے اور جو محنت اور خرچ آپ نے میری عمدہ اور اعلیٰ تعلیم کے بارے میں برداشت کیا ہے اس کی نظیر کم مل سکتی ہے۔یہ صرف آپ کے عمدہ خیالات اور مجھ کو اعلیٰ تعلیم دینے کا اثر ہے کہ میں حافظ ہوا۔ میں نے فارسی پڑھی، میں نے عربی پڑھی، میں نے انگریزی میں علوم حاصل کیے اور بارسٹر ہوں۔......اب اگر کوئی پوچھے کہ یہ باتیں مہدی کو کیونکر حاصل ہیں تو اس کا مختصراً جواب بجز اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ مہدی کے پیارے باپ نے اس کی تعلیم عمدہ طور پر انجام دی۔

والد صاحب! مبارک ہے وہ باپ جو اپنے بیٹے کو ایسی تعلیم دے اور مبارک ہے وہ بیٹا جو اپنے ایسے باپ پر فخر کرے۔اے اللہ اب مجھ کو اس قابل کر کہ میں اپنے پیارے باپ کی خدمت پورے طور پر کر سکوں اور اپنا فرض ادا کروں[۴]۔

مہدی حسن ۸؍ اکتوبر ۱۸۸۸ء کو بی،اے آکسن اور بار ایٹ لا کی سند لے کر وطن واپس آئے۔ ان کے استقبال کے لئے شیخ حبیب اللہ نے اعظم گڑھ میں اپنے مکان پر ایک جشن منعقد کیا۔یہ جشن سات روز تک جاری رہا۔اور سات روز تک مسلسل دعوتوں کا سلسلہ قائم رہا جن میں تمام عمائدین شہر و سرکاری عہدے داران،حکام اور وکلا وغیرہ شریک ہوئے۔علامہ شبلی نعمانی علی گڑھ سے آکر شریک جشن مسرت ہوئے اور اس موقع پر ایک استقبالیہ نظم بھی پڑھی، جس کی ردیف ''آمدہ'' تھی۔یہ نظم اب کہیں دستیاب نہیں ہے۔علامہ شبلی نے اپنا دیوان شائع کرتے وقت اسے مولوی محمد سمیع سے مانگا تھا، مگر وہ دستیاب نہ کرا سکے۔یہی سبب ہے کہ وہ کلیات میں بھی شامل نہیں ہے۔

مہدی حسن کی آمد کی خوشی میں شیخ حبیب اللہ نے بندول میں ایک شاندار کوٹھی تعمیر کرائی جو خستہ اور خراب حالت میں کسی قدر اب بھی موجود ہے اور تعمیر کرنے والوں کے عزم و حوصلہ کی داستان عزم

---

[۴] ماخذ سابق ص ۱۹۷۔۱۹۸

وحوصلہ سنارہی ہے لیکن اپنی بربادی پر شکوہ سنج بھی ہے۔

مہدی حسن بیرسٹر کی صحت لندن میں ہی خراب ہوگئی تھی جو وطن آکر بھی بحال نہ ہوسکی۔ مجبوراًانہوں نے اپنے مرتبے سے اتر کر جنوری ۱۸۹۲ء میں الہ آباد ہائی کورٹ میں منصفی کا عہدہ قبول کرلیا۔پانچ برس چھ ماہ اس منصب پر فائز رہے۔علالت دن بہ دن بڑھتی گئی۔ بالآخراسی بیماری میں ۲۹؍جون ۱۸۹۷ء کو اعظم گڑھ میں وفات پائی۔اس حادثۂ فاجعہ پر علامہ شبلی کس طرح ٹوٹ کر روئے، ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> لوبھائی ہم میں ایک عنصر کم ہوگیا۔عزیزی مہدی نے جان دی اور کس حالت کے ساتھ کہ کلیجے کے ٹکڑے اڑ گئے۔ میں بدبخت پاس تھااور اس لیے جتنے تیر پھینکے سب میرے ہی جگر پر لگے۔ ہائے اس کی جواں مرگی۔ہائے کیا معلوم تھا کہ وہ اس قدر جلد دنیا سے چلا جائے گا، ورنہ مجھ پر لعنت اگر میں اس سے ناراض رہتا۔ہائے سب برائیوں پر وہ سب سے اچھا تھا۔آج چوتھا دن ہے لیکن خدا کی قسم اس وقت تک دل نہیں ٹھہرتا۔ سو بار رو چکا ہوں اور دل نہیں ٹھہرتا۔اس کی ایک محبوب یادگار ہے جسے وہ بین کہتا تھا، یعنی شافیہ، اس سے بارہا لپٹ کر رو یا ہوں لیکن کچھ بھی تو تسلی نہیں ہوتی۔اس کو تسلی دینا چاہتا ہوں لیکن خود بے قرار ہو جاتا ہوں۔ایک اور اس کے نام سے وابستہ بدقسمت ہے جو پہلے چھوٹی بھاوج تھی، لیکن اب پیاری بہن ہے۔ تم لوگ مزے سے باہر ہو۔یاں آفت زدوں کو سنبھالنا میرے سر چھوڑا ہے۔ ہائے مہدی وائے مہدی۔
> بدبخت ازلی۔ شبلی[۵]

مہدی حسن کی شادی گاؤں ہی میں ہوئی تھی۔ان کی بیوی کا نام عالیہ تھا۔ مکاتیب شبلی میں ان کا ذکر آیا ہے۔مہدی حسن کے انتقال کے بعد علامہ شبلی عالیہ بیگم کے اخراجات کے لئے ایک رقم بھیجتے تھے۔مہدی حسن کے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ صرف ایک بیٹی شافیہ تھی جو ان کے ماموں زاد بھائی حاجی شیخ محمد صاحب (م:۱۹۳۶ء) پھریہا سے بیاہی تھیں۔۱۹۲۷ء میں مکہ مکرمہ میں دوران حج وہ راہی ملک عدم ہوئیں اور اسی پاک زمین کا پیوند ہوئیں۔ان کے بھی کوئی اولاد نہیں تھی۔اور انہی کی وفات پر مہدی حسن کی نسل کا خاتمہ ہوگیا۔

مہدی حسن کے داماد شیخ محمد ان کے ماموں زاد بھائی اور ایک بڑے زمین دار تھے۔ قومی وملی کاموں

---

[۵] مکاتیب شبلی، جلد اول، ص۹۹۔۱۰۰

میں آگے بڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ان کے والد نے اپنی قیمتی زمین اگر دارالمصنّفین پر وقف کی تھی تو انہوں نے اپنی زمین شبلی نیشنل کالج پر وقف کر کے صحیح وارث ہونے کا ثبوت دیا۔

مہدی حسن بڑے ذہین، طباع اور غیر معمولی شخص تھے۔افسوس کہ ان کی کم عمری کی موت نے ملک کو ایک ماہر قانون داں، ایک ادیب اور ایک انشاپرداز کی انشاپردازیوں سے محروم کر دیا۔تاہم زمانۂ تحصیل میں لندن سے انہوں نے اپنے والد شیخ حبیب اللہ، چچا شیخ مجیب اللہ اور برادر اکبر علامہ شبلی نعمانی کو جو خطوط لکھے، جس میں وہاں کے حالات، طرز معاشرت اور علم اور وقت کی قدر وغیرہ گوناگوں واقعات و موضوعات پر اظہار خیال کیا، اس سے اس دور کے لندن بلکہ یورپ کا ایک منظر نامہ سامنے آجاتا ہے۔ مثلاً لندن کے بارے میں لکھا:

اگر آپ یہ چاہیں کہ ہم اعلیٰ درجہ کی شائستگی، اخلاق، محبت، انسانیت، صفائی، امارت، حسن، علم، دولت تمام خوبیوں کو اونچے ٹیلے سے دیکھیں تو وہ بلند مقام اسی لندن میں مل سکتا ہے۔ اگر آپ کو یہ منظور ہے کہ بد معاشی، بد چلنی، قزاقی، دغا بازی، دنیا بھر کی برائیوں کو شکل مجسم میں معائنہ کریں تو وہ لندن ہی کی سڑکوں پر ممکن ہے۔[۶]

یہ تمام خطوط انہوں نے بڑے دلچسپ اسلوب و انداز میں اور بے ساختہ لکھے ہیں۔ان کا اسلوبِ نگارش بڑا پر کشش اور دلفریب ہے۔ڈاکٹر ابن فرید نے صحیح لکھا ہے:

جہاں وہ گل افشانی پر اتر آتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک شوخ و سنگ پہاڑی ندی ہے جو اردو کی ناتراشیدہ چٹانوں کے درمیان اچھلتی، کودتی، بھاگتی، مڑتی، بل کھاتی چلی جارہی ہے۔[۷]

ڈاکٹر ابن فرید نے مہدی حسن کے تمام (۶۲) خطوط کا مطالعہ کیا تھا۔ان کی یہ خواہش تھی کہ ان خطوط کو شائع ہونا چاہئے۔اس غرض سے انہوں نے ایک مفصل مضمون بھی لکھا تھا۔ان کا خیال تھا کہ:

اگر اس کی اشاعت کی کوئی سبیل پیدا ہو جائے تو غالب اور شبلی کے بین بین کا ایک منفرد اسلوب کا مالک مکتوب نگار منظر عام پر آجائے جو لندن سے بیٹھ کر خط لکھتا ہے اور لاشعوری طور پر انگریزی فقروں، محاوروں اور بول چال کے جملوں کو اردو میں ڈھالتا چلا جاتا ہے۔[۸]

---

[۶] مکتوب بنام شبلی۔ ۵/جون ۱۸۸۵ء (علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط ص ۱۷۲)

[۷] ادیب علی گڑھ۔ جولائی۔ اگست ۱۹۶۳ء ص ۹

[۸] ادیب علی گڑھ جولائی۔ اگست ۱۹۶۳ء ص ۸

ڈاکٹر ابن فرید نے مہدی حسن کے خطوط کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا تھا اور قدرے تفصیل سے اس کا جائزہ لیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ :

مہدی کے خطوط میں ایک والہانہ پن ہے، شوخی اور بے تکلفی ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں اور مناسب ہوگا کہ ان کے خطوط میں علامہ شبلی کا اسلوب جھلکتا ہے۔ معلوم نہیں یہ اسلوب انہوں نے علامہ سے اخذ کیا ہے یا علامہ نے اپنے خاندان کے انگریزی داں رشتہ داروں سے اخذ کیا ہے۔ حجاب اور پردہ داری کا انداز مہدی کے یہاں نہیں پایا جاتا۔ وہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں، مشاہدہ کرتے ہیں یا تجربہ کرتے ہیں وہ بے کم وکاست اپنے باپ کو بھی لکھ دیتے ہیں۔ یہ شبلی کے خاندان کی صفت ہے۔ علامہ شبلی کے لئے بھی یہی لطفِ بیان رسوائی کا باعث ہوا اور مہدی کے لئے بھی۔ اس کی جڑیں ہمیں ان دونوں کے والد شیخ حبیب اللہ کے یہاں ملتی ہیں۔ ان کو جب مہدی کے خطوط ملتے تھے تو وہ اپنے حلقۂ احباب میں سناتے تھے جن پر حاشیہ آرائیاں ہونے لگیں اور شبلی کو مہدی کی یہ بدنامی ناگوار گذری۔ چنانچہ انہوں نے اس کا اظہار اپنے ایک عزیز مولوی محمد سمیع کے خط میں کیا اور ان کو ہدایت کی کہ وہ مہدی کو اس سلسلے میں احتیاط کی تاکید کریں[۹]۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ علامہ نے خود کبھی احتیاط نہ کی۔ محمد مہدی کے خطوط سے ان کی بعض غیر معمولی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے، مثلاً زیادہ تر وہ پیرا گراف اس طرح شروع کرتے ہیں جیسے کوئی مقرر سامعین کو خطاب کر رہا ہو۔ جزئیات نگاری میں ان کو کمال حاصل ہے۔ لطفِ بیان کے لئے لطیفے یا شگوفے بھی چھوڑتے چلتے ہیں۔ اپنی قابلیت اور ذہانت کا انہیں غیر معمولی طور پر احساس ہے۔ چنانچہ اس کا ذکر تفصیل کے ساتھ کرتے ہیں، خود محظوظ ہوتے ہیں اور مکتوب الیہ کی تصدیق کے بھی متمنی رہتے ہیں۔ مگر جب ان کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنی مدح سرائی خود کر رہے ہیں تو اس کی تاویل بھی کرتے ہیں۔ وفور جذبات سے ان کا ہر خط مملو رہتا ہے۔ لندن اور یورپ کا ماحول، عادات واطوار اور معاشرتی اقدار کے سامنے ان کی نظریں خیرہ ہیں، لیکن ان کا دل ہمیشہ اعظم گڑھ، بندول اور جونپور میں اٹکا رہتا ہے۔ وہ دور رہ کر بھی اپنے عزیزوں کو نہیں بھولتے۔ بعض خطوط میں سلام کہنے کے لئے ناموں کی طول طویل فہرست درج کر دیتے ہیں۔ محمد سلمہ تو شاذ ونادر ہی ان کے کسی خط میں نظر انداز ہوتے ہیں۔ اپنے پتے میں اپنے قلم سے مسٹر لکھتے ہیں، داڑھی منڈوانے، عورتوں کی حکومت اور مغربی لباس

---

[۹] مکاتیب شبلی ج ۱ ص ۹۵

کے بے حد مؤید نظر آتے ہیں، مگر یہ بھی نہیں بھولتے کہ ایک ہندوستانی کی شرف و مقبولیت کے لئے کن صفات کی ضرورت ہے؟ کیوں وہ بلند نہیں ہو پاتا؟ منشی محمد اکرام کے صاحب زادے محمد بلال اور دوسرے ہم وطن عبدالرؤف سے خوش نہیں رہتے، لیکن جب ہندوستان واپس جاتے ہیں تو مہدی اپنے والد کو تاکید کرتے ہیں کہ ان کے استقبال کے لئے وہ جونپور جائیں اور اپنے یہاں قیام کروائیں۔ ان سب حقائق کو اگر مربوط کیا جائے تو آخر انیسویں صدی کے مشرقی گھرانے کی تہذیب اور اخلاقی قدروں کا واضح طور پر اندازہ ہوتا ہے۔ یہ تہذیب ہمیں ان خطوط کے ذریعے ذہنی طور پر مرعوب اور احساس کمتری کا شکار نظر آتی ہے، مگر بعض اچھی صفات نے اس کے اندر اتنی گہری جڑیں پکڑلی ہیں کہ وہ اس وقت تک خشک نہیں ہوئی تھیں۔ یہ مشرق اور مغرب کی کشمکش کا دور تھا۔ ایک تہذیب دوسری تہذیب پر بڑی تیزی کے ساتھ غالب آرہی تھی، ایک رنگ ماند پڑ رہا تھا اور دوسرے کے نقوش ابھر رہے تھے۔ مہدی کے خطوط میں ان رنگوں اور نقوش کو واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔[10]

اس طویل تبصرے سے مکاتیب مہدی کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مہدی حسن کے خطوط ان کے خانوادے کے کسی فرد کے پاس محفوظ تھے۔ وہ اسے مرتب کر کے شائع کرانا چاہتے تھے اور غالباً اسی غرض سے انہیں دہلی لے گئے۔ ان سے یہ خطوط ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی (۱۹۳۷ء-۲۰۱۳ء) نے لئے اور ان پر ایک مضمون لکھا جو ان کے پہلے مجموعہ مضامین ''ادب اور وابستگی''، میں شامل ہے۔ اس کے بعد انہوں نے وہ خطوط ڈاکٹر ابن فرید کو دے دیے۔ ڈاکٹر ابن فرید نے بھی ان پر ایک مضمون ''محمد مہدی کے مکاتیب لندن'' لکھا جو ماہنامہ آج کل، دہلی (جون ۱۹۶۳ء) میں شائع ہوا۔ پھر یہی مضمون ماہنامہ ادیب علی گڑھ (جولائی، اگست ۱۹۶۳ء) میں چھپا۔ اس کو پڑھ کر بعض اہل ذوق نے ان خطوط کو شائع کرنے کی فرمائش کی۔ چنانچہ ڈاکٹر ابن فرید نے ان ۶۲ خطوط میں سے محض ۵ خطوط ماہنامہ ادیب علی گڑھ میں ''شوق کا دفتر کھلا'' کے عنوان سے دو قسطوں (نومبر، دسمبر ۱۹۶۳ء) میں شائع کئے۔ اس کے بعد اس کی کوئی اور قسط شائع نہیں ہوئی اور نہ یہ معلوم ہو سکا کہ وہ مجموعہ کیا ہوا۔

ناچیز نے اپنی کتاب ''علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط''، میں ڈاکٹر ابن فرید کے شائع کردہ ۵

---

[10] ماہنامہ ادیب علی گڑھ، جولائی۔ اگست ۱۹۶۳ء ص ۷-۸

خطوط شامل کرنے کے علاوہ ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی کے مضمون سے مکاتیب مہدی کے اقتباسات بھی نقل کردیے گئے ہیں۔ یہ اقتباسات انہوں نے تاریخ وار نقل کئے ہیں اور اچھا یہ کیا تھا کہ کثرت سے خطوط کے اقتباسات نقل کئے تھے۔ ان کی بدولت مہدی حسن کے بہت سے خیالات اور خطوط کے اقتباسات محفوظ رہ گئے۔ ڈاکٹر ابن فرید نے بھی اپنے پہلے مضمون[۱] میں بعض اقتباسات نقل کئے ہیں، مگر انہوں نے کئی اقتباسات کو جو شیخ مجیب اللہ کے نام تھے، انہیں شیخ حبیب اللہ کے نام درج کردیا ہے۔ حالاں کہ خود انہوں نے جو اصل خط شائع کیا ہے وہ شیخ مجیب اللہ کے نام ہے۔

چونکہ اصل خطوط دستیاب نہیں ہوئے اور مطبوعہ خطوط پر انحصار کرنا پڑا، اس لئے مہدی حسن کے املا اور رسم الخط پر بحث کی گنجائش نہیں تھی۔ جن لوگوں نے یہ خطوط شائع کئے انہوں نے اس کا اہتمام نہیں کیا۔ مثلاً مہدی حسن نے تقریباً ہر جگہ ڈاڑھی کو داڑھی لکھا ہے۔ پٹخ کو پٹک اور بالکل کو ''بالکل'' لکھا ہے۔ اسی طرح تیار کو ہر جگہ طیار لکھا ہے۔ یاد رہے کہ علامہ شبلی بھی تیار کو طیار ہی لکھتے تھے۔ ان کی تحریروں میں جہاں تیار لکھا ہوا ملے آپ تسلیم کرلیں کہ کسی نے تصرف کیا ہے۔

مہدی حسن نے عربی و فارسی جی لگا کر پڑھی تھی۔ خطوطِ مہدی سے ان کی عربی و فارسی دانی کا اندازہ ہوتا ہے۔ قرآن کی آیات، اردو و فارسی اشعار اور محاورات کا بر محل استعمال، ان کے علم و ادب سے گہرے مطالعہ و شغف کا پتہ دیتے ہیں۔ رہی جدید تعلیم کی بات تو اس میں تو وہ اپنے علاقے کے پہلے شخص تھے جو لندن جاکر بار ایٹ لا ہوئے اور جن کی انگریزی تقریر و تحریر کی داد اہل زبان نے دی۔ اس کا ذکر انہوں نے اپنے بعض خطوط میں کیا ہے۔

مہدی حسن سر سید اور تحریک علی گڑھ کے نمائندہ تھے۔ لندن میں انہوں نے طلبہ کے درمیان تقریباً ہر مواقع پر سر سید کی فکر کو نمایاں کیا۔ اور ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ جو طلبہ اس سے اتفاق نہیں رکھتے تھے وہ ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔

باوجود ان سب باتوں کے حیات شبلی میں ان کا ذکر ایک دو جگہ ضمناً اور اجمالاً آیا ہے۔ اس سے نہ ان کی ابتدائی تعلیم کا اندازہ ہوتا ہے نہ ان کے افکار و خیالات کا۔ حتیٰ کہ حیات شبلی سے ان کی تاریخ پیدائش بھی معلوم نہیں ہوتی۔ علامہ شبلی کو ان سے بڑی محبت تھی۔ مکاتیب شبلی میں اس کے شواہد موجود ہیں۔ خود مہدی اپنے بڑے بھائی علامہ شبلی کے فضل و کمال کے بڑے معترف و مداح تھے۔ ان کے بعض خطوط

---

[۱] ماہنامہ آج کل دہلی، جون ۱۹۶۳ء

میں بھی ان کا والہانہ ذکر آیا ہے۔

مہدی حسن جب بیرسٹری پاس کر کے اعظم گڑھ واپس آئے تو ان کے والد شیخ حبیب اللہ نے اعظم گڑھ میں جو جشن منعقد کیا تھا، اس موقع پر علامہ شبلی نے مہدی حسن کے لئے والہانہ استقبالیہ نظم پڑھی۔ البتہ ان کی دوسری ماں، جو غیر کفو تھیں، کی طرف داری کے سبب علامہ شبلی مہدی حسن سے کسی قدر ناخوش ہوئے اور اس کا اظہار بھی کیا۔ بس یہی ذرا سی گھر کی بات تھی جسے شیخ محمد اکرام نے ''شبلی نامہ'' میں افسانہ بنا دیا اور نفسیاتی مطالعے کے نام پر علامہ شبلی سے رشک وحسد کی داستان گھڑ دی۔ لیکن یہ محض شیخ محمد اکرام کی اختراع ذہنی ہے۔ وہ مہدی حسن کی بے وقت موت پر پھوٹ پھوٹ کر روئے اور ہمیشہ رنجیدہ رہے۔ احباب کے نام ان کے خطوط میں اس رنجیدگی کا ذکر ملتا ہے۔ ۱۷ سال بعد منجھلے بھائی محمد اسحاق نے ۱۹۱۴ء میں یکایک انتقال کیا، جو ان کے دست و بازو تھے، اس موقع پر بھی انہوں نے مہدی کی موت کا ذکر بڑی رنجیدگی سے کیا۔

دراصل مہدی حسن بہت بے باک اور بے ریا شخص تھے۔ جو سوچتے، سمجھتے اور دیکھتے وہ بے دھڑک کہہ جاتے بلکہ کر جاتے تھے، جبکہ علامہ شبلی کو اپنی تمام تر روشن خیالی کے باوجود علما سے کٹ کر رہنا گوارہ نہ تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شبلی کو بھائیوں میں مولوی محمد اسحاق وکیل ہائی کورٹ سے زیادہ تعلق خاطر تھا۔ علامہ شبلی خود تو علی گڑھ، حیدرآباد اور لکھنؤ میں علمی اور قومی کاموں میں مصروف رہتے اور ان کے بچے بندول اور اعظم گڑھ میں رہتے۔ ان سب کی دیکھ بھال کا بار بھی محمد اسحاق کے ذمے تھا۔ زمیندارانہ مشاغل اور اس کے تمام مسائل و مشکلات کا بار بھی محمد اسحاق ہی اٹھاتے رہے اور ۱۲؍ نومبر ۱۹۰۰ء کو شیخ حبیب اللہ کی وفات کے بعد سب کچھ انہیں کے ذمہ تھا اور وہ علامہ شبلی کی خواہشوں کا بہت احترام کرتے تھے۔ نیشنل اسکول کی ذمہ داریاں بھی انہوں نے اپنے کاندھوں پر اٹھا رکھی تھیں۔ مجلس موازنہ ترقی قومی اعظم گڑھ بھی انہی کے ذمہ تھی۔ وہ علامہ شبلی کے مزاج و مذاق کا بھی بڑا خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ وفات سے چند ماہ پہلے انہوں نے اعظم گڑھ کے قصبات میں تعلیمی اداروں کے قیام کی بھی کوشش شروع کر دی تھی۔ انہیں اگر زندگی نصیب ہوئی ہوتی اور وہ اپنے عزائم کی تکمیل میں کامیاب ہو جاتے تو شاید اعظم گڑھ کا تعلیمی منظر نامہ آج کچھ اور ہی ہوتا۔ بہر حال ان وجوہات سے علامہ شبلی کو ان سے کچھ زیادہ تعلق خاطر تھا۔ پھر علامہ شبلی کے سوانح نگار مولانا سید سلیمان ندوی کا علامہ شبلی سے تعلق بھی اسی آخری دور کا ہے۔ محمد اسحاق کے نام علامہ شبلی کے خطوط بھی انہیں زیادہ ہاتھ آئے اور انہوں نے جو دیکھا اور سنا اس کا ذکر فطری طور پر حیات شبلی میں زیادہ کیا۔ شیخ

محمد اکرام اس معاملے میں کیا کسی معاملے میں حیات شبلی سے آگے نہ بڑھ سکے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ علامہ شبلی کو مہدی حسن سے کچھ کم انس نہیں تھا۔ علامہ شبلی کے کئی خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مہدی کے لئے برابر فکر مند رہے۔ خاص طور پر ان کی صحت کے سلسلے میں۔ ایک بار مہدی نے ان سے کسی کی تاریخ کہنے کی فرمائش کی تو ایک کے بجائے دو، تین تاریخیں کہہ کر بھیجیں۔ وہ مکاتیب شبلی میں محفوظ ہو گئی ہیں۔

۱۹۱۴ء میں محمد اسحاق وکیل کی وفات پر علامہ شبلی نے جو دلدوز مرثیہ لکھا ہے، اس کے بعض اشعار میں بھی مہدی حسن کا نام آیا ہے۔ یہ ذاتی معاملات و مسائل اپنی جگہ لیکن مہدی حسن کے خطوط واقعی بڑے دلکش ہیں۔ ان سے جہاں خانوادۂ شبلی کے حالات اور فکر و خیال کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں عہد شبلی کے ایک جدید اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص کے خیالات اور اس کے ادبی مذاق کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ:

> مکاتیب مہدی میں ایک ادبی شان ہے۔ وہ ایک شگفتہ، حوصلہ مند شخصیت کے ترجمان ہیں اور ان میں بڑا کس بل ہے۔ یوں بھی مولانا شبلی اور ان کے خاندانی ماحول کو سمجھنے کے لئے ان کا مطالعہ مفید بلکہ ضروری ہے۔ امید ہے کہ ان کی اشاعت کی سبیل پیدا ہو جائے گی۔ جس سے ادبِ اردو میں ایک بیش قیمت اضافہ ہو جائے گا۔[۱۲]

لیکن ان خطوط کی اشاعت اس وقت ممکن نہ ہو سکی اور پھر وہ خطوط کہاں گئے کچھ پتہ بھی نہیں۔ نہیں معلوم کہیں محفوظ ہیں یا ختم ہو گئے۔

پچاس برس بعد مجھے کتب و رسائل سے جو کچھ ہاتھ آیا اسے اپنی کتاب ''علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط'' میں یکجا کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ مطالعۂ شبلی میں مکاتیب مہدی حسن کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔

محمد اسحاق وکیل: مسٹر محمد اسحاق وکیل (م: ۱۲؍اگست ۱۹۱۴ء) ماہر قانون داں اور الہ آباد ہائی کورٹ کے نامور وکیل تھے۔ بڑے متحرک اور سرگرم شخص تھے۔ وہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے رکن رہے۔ اس کے متعدد اجلاسوں میں شریک ہوئے اور اس کا مالی تعاون بھی کیا۔

یہ علامہ شبلی کے منجھلے بھائی تھے۔ موضع بندول ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ تاریخ پیدائش

---

[۱۲] شیخ محمد اکرام، یادگار شبلی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور، ۱۹۹۴، ص ۲۵۔۲۶۔

معلوم نہیں ہو سکی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد علی گڑھ گئے۔ وہاں سے بی۔ اے اور ایل ایل بی کی اسناد حاصل کیں۔ واپس آئے تو ہائی کورٹ الہ آباد میں وکالت شروع کی اور جلد ہی بڑی شہرت اور نیک نامی حاصل کرلی۔ عین جوانی میں ۱۲؍اگست ۱۹۱۴ء کو یکایک انتقال کیا۔ خانوادہ شبلی کے بعض بزرگوں نے بتایا کہ انہیں حسد میں زہر دیا گیا تھا، مگر اس کی تصدیق علامہ شبلی کی کسی تحریر سے نہیں ہوتی۔ ان کی تدفین الہ آباد میں ہوئی۔

محمد اسحاق علامہ شبلی کے دست و بازو تھے اور وہ انہیں بہت عزیز رکھتے تھے ۔ تمام گھریلو اور زمیندارانہ ذمہ داریاں انہیں کے سپرد تھیں۔ یہ علامہ شبلی کے بڑے معین و مددگار رہے۔ نیشنل اسکول اعظم گڑھ کے اصلاً ذمہ دار بھی یہی تھے۔ اسے انہوں نے بہت ترقی دی اور مزید ترقی دینے کا عزم رکھتے تھے۔ وفات سے دو ماہ قبل ۶؍جون ۱۹۱۴ء کو نیشنل اسکول کے استحکام کے لئے احباب اور عمائدین اعظم گڑھ کو جمع کیا اور "اعظم گڑھ مسلم ایجوکیشن سوسائٹی" قائم کی، جس کے صدر علامہ شبلی اور سکریٹری مولانا حمید الدین فراہی تھے۔ یوں تو اس سوسائٹی میں اعظم گڑھ کے متعدد رؤسا و عمائدین شامل تھے مگر بنیادی طور پر خانوادہ شبلی و فراہی پورے طور پر شامل تھا۔

مولوی محمد اسحاق نے خود کو اراکین میں شامل کیا مگر واقعہ یہ ہے کہ نام کو سب تھے مگر کام کے لئے سینہ سپر ہونا مولوی محمد اسحاق ہی کا کام تھا۔ شبلی اسکول ہی نہیں وہ اعظم گڑھ کے تمام بڑے قصبات میں نیشنل اسکول قائم کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، اس کے لئے انہوں نے اپنی جیب سے ایک رقم (پانچ سو روپئے) بھی مختص کرلی تھی، مگر افسوس ان کی بے وقت کی موت سے ان کے سارے ارمان ادھورے رہ گئے۔ علامہ شبلی کو ان کی موت سے سخت صدمہ پہنچا۔ چنانچہ ان کا بڑا دلدوز مرثیہ لکھا، جو ان کے اردو کلیات میں شامل ہے۔ بطور نمونہ دو بند یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

ہم سے ناکاروں کی اک قوت عامل تھا وہی — مایۂ عزت اجداد کا حامل تھا وہی
مسند والد مرحوم کے قابل تھا وہی — یوں تو سب اور بھی اعضا ہیں مگر دل تھا وہی
اب وہ مجموعۂ اخلاق کہاں سے لاؤں — ہائے افسوس میں اسحاق کہاں سے لاؤں

یہ بھی اے جان برادر کوئی جانے کا ہے طور — اپنے بچوں کی نہ کچھ فکر نہ تدبیر نہ غور
ابھی آنے بھی نہ پایا تھا ترے اوج کا دور — کیا ہوا تجھ کو کہ تو ہو گیا کچھ اور سے اور
چھوڑ کر بچوں کو بے صبر وسکوں جاتا ہے — کوئی جاتا ہے جو دنیا سے تو یوں جاتا ہے

مرحوم اسحاق نعمانی کے بڑے پوتے احمد اسحاق نعمانی ریٹائرڈ نیوی کیپٹن کے بقول بڑے دادا یعنی علامہ

شبلی انہی کے غم میں چل بسے۔ مکاتیب شبلی سے بھی ان کے شدید دکھ اور صدمے کا اظہار ہوتا ہے۔
علامہ شبلی سے ان کی مسلسل خط و کتابت رہی۔ مکاتیب شبلی میں ان کے نام ۲۶؍ خطوط شامل ہیں، اور مکتوبات شبلی میں تین نودریافت خطوط شامل ہیں۔ اس طرح اب تک ان کے نام ۲۹؍ خطوط شائع ہو چکے ہیں۔ ان خطوط سے بھی خانوادۂ شبلی کے ذاتی حالات اور اندرون خانہ واقعات کا ایک منظر سامنے آتا ہے۔

کھنڈا ضلع الہ آباد میں غالباً محمد اسحاق وکیل کی سسرال تھی۔ ان کی تین شادیاں ہوئی تھیں۔ پہلی بیوی موضع بندول کی تھیں۔ دوسری غالباً اسی کھنڈا کی اور تیسری غازی پور کی رہنے والی تھیں۔ اول الذکر بیویوں نے کم مدت حیات پائی۔ البتہ آخر الذکر عرصہ تک زندہ رہیں۔ بعد از وفات انہوں نے اسحاق صاحب کی الہ آباد کی تمام زمین و جائیداد پر قبضہ کر لیا تھا، اس کے لئے انہوں نے علامہ شبلی اور ان کے چھوٹے بھائی محمد جنید سب جج کان پور پر مقدمہ بھی کر دیا تھا۔ بہر حال علامہ شبلی نے ان سے صلح کر کے یتیم بچوں کا حق دلانے کی کوشش کی۔ صلح کے فوراً بعد علامہ شبلی نے بھی رخت سفر باندھا۔ اسحاق صاحب نے ۱۲؍ اگست ۱۹۱۴ء کو اور علامہ شبلی نے ۱۸؍ نومبر ۱۹۱۴ء کو وفات پائی۔ یہی وہ دور ہے جس میں علامہ شبلی سیرت نبویؐ اور دارالمصنّفین کو پایۂ تکمیل پہنچانے کے لئے مسلسل کوشاں رہے۔ اور دونوں کو اس حد تک پہنچا کر رخصت ہوئے کہ دنیا آج بھی انہی کارناموں سے انہیں یاد کرتی ہے۔ بلاشبہ دونوں انتہائی عظیم الشان کارنامے ہیں۔

مولوی محمد اسحاق کے ایک عزیز دوست، شاعر و ادیب، مصنف اور ''جہاں آرا'' کے مورخ مولوی محبوب الرحمن کلیمؔ جیراجپوری (۱۸۶۸-۱۹۲۵ء) وکیل اور اعظم گڑھ ایجوکیشن سوسائٹی کے ایک رکن تھے، انہوں نے ان کا ایک مرثیہ لکھا تھا جو مطبع کاظمیہ جون پور سے شائع ہوا تھا، مگر وہ اب کہیں دستیاب نہیں ہے۔

محمد اسحاق وکیل کے نام علامہ شبلی کے خطوط سے خانوادۂ شبلی کے نجی اور ذاتی حالات کے ساتھ اسکول اور کالج کے سلسلے کی مصروفیات کا بھی علم ہوتا ہے۔ علامہ شبلی نیشنل اسکول کے متعلق ایک خط میں لکھتے ہیں:

> سردست میرے نزدیک بھی وہ ایک حقیر صورت رکھتا ہے، لیکن ایک لوہار کی اس میلی چمڑی سے کم حیثیت نہیں ہے جس کو اس نے مدت تک اپنے پاؤں کے محفوظ رکھنے کے لئے استعمال

کیا تھا اور جو بعد کو ایک معمولی عَلَم پر چڑھ کر تین ہزار برس تک درفش کاویانی کے فخر آمیز لقب سے پکارا گیا۔[۱۳]

بلاشبہ مولوی محمد اسحاق نعمانی اعظم گڑھ کے انتہائی اہم اور نمایاں لوگوں میں تھے۔ ضلع اعظم گڑھ کی تعلیمی ترقی میں ان کا بڑا نمایاں حصہ ہے۔

محمد جنید نعمانی: محمد جنید نعمانی (م: ۱۲؍اپریل ۱۹۳۳ء) سب جج کان پور علامہ شبلی نعمانی کے برادر اصغر تھے۔ ۱۸۷۸ء میں موضع بندول میں پیدا ہوئے۔ گھریلو تعلیم کے بعد شبلی نیشنل اسکول اعظم گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔ یہاں ان کے ایک لائق استاذ قاضی عبدالرحمن حیرت اعظم گڑھی تھے۔ وہ علامہ شبلی نعمانی کے شاگرد، ادیب وشاعر اور متعدد کتب و رسائل کے مصنف و مولف تھے۔ ان کے بعض رسائل کتب خانہ دارالمصنّفین میں محفوظ ہیں۔ علامہ شبلی کا ایک طویل مرثیہ ''ماتم شبلی'' بھی ان کی یادگار ہے۔ وہ نیشنل اسکول میں استاد تھے۔ علامہ شبلی کے فرزند حامد حسن نعمانی (۱۸۸۰-۱۹۴۲ء) اور مسٹر جنید نعمانی (۱۸۷۸-۱۹۳۳ء) ان کے ہم عمر تھے۔ علامہ شبلی نے ان دونوں کی دیکھ بھال پر قاضی عبدالرحمن حیرت کو مامور کیا تھا۔[۱۴]

محمد جنید نعمانی شبلی نیشنل اسکول اعظم گڑھ کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے ایم اے او کالج علی گڑھ گئے۔ وہاں پہلے بی اے کیا۔ پھر قانون کی تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں اعظم گڑھ واپس آکر وکالت کا مشغلہ اختیار کیا۔ کچھ دنوں بعد منصف کے عہدے پر منتخب ہو گئے۔ پھر ترقی پاکر کان پور میں سب جج کے عہدے پر مامور ہوئے۔ مرحوم کم گو اور خاموش مزاج تھے۔ نیشنل اسکول سے تعلق کے علاوہ کسی طرح کی ان کی سرگرمی کا ذکر نہیں ملتا۔ ۱۹۱۴ء میں ان کے بڑے بھائی محمد اسحاق وکیل نے جو اعظم گڑھ ایجوکیشن سوسائٹی قائم کی تھی اس کے ایک رکن اساسی یہ بھی تھے۔ ابتدا میں اسکول کے کاموں میں دلچسپی لیتے تھے۔ ایک میٹنگ میں جب ان پر فیس رکنیت ادا کرنے پر زور دیا گیا تو چند اراکین نے دعویٰ کیا کہ چونکہ وہ رکن اساسی ہیں اس لئے فیس نہ ادا کرنے کے مجاز ہیں، لیکن ان کا یہ دعویٰ تسلیم نہیں کیا گیا۔ بلکہ انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ بہر صورت فیس رکنیت ادا کریں۔

جنید نعمانی جب سب جج کان پور ہو کر کان پور چلے گئے تو اسکول سے ان کی دلچسپی کم ہو گئی اور پھر وہ

---

[۱۳] مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۳۵-۳۶

[۱۴] قاضی عبدالرحمن حیرت، ماتم شبلی، کاظمی پریس، جون پور، ب-ت، ص ۱۵

بیمار ہوئے۔ برسوں علاج و معالجہ جاری رہا مگر جانبر نہ ہو سکے۔ علاج کے لئے دہلی میں دو ماہ مقیم رہے۔ ۱۲؍اپریل ۱۹۳۳ء کو دہلی ہی میں انتقال کیا۔ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔ ۱۳؍اپریل ۱۹۳۳ء کے ''انقلاب'' میں ان کی وفات کی خبر ان الفاظ میں شائع ہوئی ہے:

۱۲؍اپریل کو حضرت مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے بھائی مولانا محمد جنید کا دہلی میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم دو ماہ سے بہ سلسلۂ علاج دہلی میں مقیم تھے۔ مرحوم کے اعزہ بھی دہلی تشریف لائے ہوئے تھے۔ جامعہ ملیہ کے اساتذہ اور طلبہ نے شب ہی میں تجہیز و تکفین کے انتظامات کئے۔ ہمیں اس حادثہ فاجعہ پر مرحوم کے متعلقین کے ساتھ دلی ہمدردی ہے۔ اللہ تعالی مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

ان کے ایک ہی بیٹے انور نعمانی تھے۔ انہوں نے ہجرت کر کے مملکت خداداد کی راہ لی۔ محمد اسحاق وکیل کی وفات پر علامہ شبلی نے جو پر درد مرثیہ کہا ہے، اس میں یہ دعا مانگی ہے:

اے خدا شبلی دل خستہ بایں موئے سپید
لے کے آیا ہے ترے درگہ عالی میں امید
مرنے والے کو نجات ابدی کی ہو نوید
خوش و خرم رہے چھوٹا یہ مرا بھائی جنید[۱۵]

یہ بات صحیح ہے کہ ضلع اعظم گڑھ کی تعلیمی ترقی میں علامہ شبلی اور خانوادہ شبلی کا بڑا نمایاں حصہ ہے۔

---

[۱۵] کلیات شبلی اردو، مرتب: سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ص: ۲۰۴

ملی مسائل

ملک کی تعمیر نو اور مسلمان

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان

zik@zik.in

"ملک کی تعمیر نو اور مسلمان" کے تین اہم پہلو ہیں۔ اولاً: ملک کی تعمیر نو کیسے ہو، دوم: مسلمان اس میں کیا حصہ لیں اور سوم: خود ہندوستانی مسلمان اپنی سوسائٹی کی تعمیر کیسے کریں۔ ابتداءً یہ کہنا ضروری ہے کہ اس موضوع پر ہمارے حلقوں میں مسلسل گفتگو ہونی چاہیے کیونکہ ملک میں ایک مؤثر اور بااختیار گروہ کی حیثیت حاصل کرنے کے لئے ہم پر بہت سی ذمہ داریاں عائد ہیں ورنہ جس حاشیے پر ہم آج خود کو پاتے ہیں وہ مزید تنگ ہوتا رہے گا۔

ملک کی تعمیر نو میں دو اہم اکائیاں شامل ہیں۔ پہلی اکائی صالح انسان کی تعمیر ہے اور دوسری اکائی ہے اداروں کی تعمیر۔

انگریزوں نے اپنی ڈیڑھ سو سالہ حکومت کے دوران کچھ مضبوط ادارے مثلاً سول سروس، فوج، پولیس، عدلیہ ضرور بنائے لیکن انسان کو بنانے کا کام انہوں نے بالکل نہیں کیا بلکہ ایک غلامی، ناانصافی اور ظلم کی خوگر قوم بنائی ورنہ سامراجیوں کا قبضہ اور استحصال زیادہ دنوں تک نہیں چل سکتا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے نتیجے میں لاغر ہونے والے برطانیہ نے ہندوستان اور دوسرے غلام ملکوں کو آزادی دی۔ نئے حکمراں اسی سانچے میں ڈھلے تھے جو انگریزوں نے اپنے تعلیمی نظام کے ذریعہ ہمارے لئے بنایا تھا۔ ہمارے نئے حکمرانوں نے مضبوط ادارے (Institutions) باقی رکھے اور کچھ نئے بنائے مثلاً پارلیمنٹ، نیز فوج کو سیاست سے دور رکھا جو ایک قابل قدر کوشش تھی۔ دوسرے ملکوں کی بہ نسبت آج بھی ہندوستان کی مقننہ، عدلیہ، صحافت وغیرہ ایک حد تک آزاد ہیں اور فوج نے انقلاب کے ذریعے حکومت پر قبضہ کی کوشش نہیں کی ہے۔ پچھلے چار دہوں سے، یعنی ایمرجنسی کے زمانے سے، ان اداروں کو کمزور بنانے کی کوشش جاری ہے اور موجودہ حاکم پارٹی نے ان اداروں پر پورا قبضہ کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کام میں بڑی حد تک کامیاب ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک فاشسٹ نظام قائم کیا جارہا ہے جو پوری طرح سے ملک کو اپنے پنجوں میں جکڑ لے گا۔

آزادی کے بعد ہمارے حکمرانوں نے جہاں اداروں کو پروان چڑھایا وہیں انھوں نے سب سے اہم اکائی، یعنی انسان یا فرد یا شہری کی تعمیر میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ یوں وہ اخلاقی کمزوریاں جو عام ہندوستانی شہری میں سامراجی زمانے کے دوران رچ بس گئی تھیں مزید گمبھیر ہوتی چلی گئیں۔ رشوت لینے اور دینے کا چلن، سرکاری اور عوامی املاک کو ہڑپنے، قانون شکنی، بات بات پر تشدد، جعلسازی، ذاتی مفاد کو عوامی مفاد پر ترجیح دینا ہمارا قومی کیریکٹر بن گیا ہے۔ یہ وہ دیمک کے کیڑے ہیں جن کے ہوتے ہوئے کوئی قوم ترقی نہیں کرسکتی ہے۔ اس لئے ہم جب بھی کوئی قومی سدھار کا ایجنڈا بنائیں تو اس میں مضبوط اداروں کے قیام کے ساتھ ساتھ قانون اور اخلاق کے پابند مہذب شہری کی تعمیر کو سرفہرست رکھیں ورنہ اقوام عالم میں ہم سر اٹھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ انہیں پالیسیوں کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان آج دنیا کے ملکوں کے مقابلے میں ہر چارٹ میں بالکل نیچے نظر آتا ہے چاہے وہ اخلاقی گراوٹ اور کرپشن کا مسئلہ ہو یا تعلیم و تہذیب کا مسئلہ ہو یا ذاتی یا سماجی صحت کا معاملہ ہو یا میڈیا کی آزادی کا مسئلہ ہو۔ ایسی بنیادی خرابیوں کے ہوتے ہوئے ہمارے وزیر اعظم کا ہندوستان کو ایک عظیم ملک بلکہ ''وشوا گرو'' (دنیا کا معلم) بنانے کا خواب ادھورا ہی رہے گا۔

موجودہ گفتگو کا دوسرا جزء یہ ہے کہ مسلمان ملک کی تعمیر میں کیا اور کیسے حصہ لیں۔ آزادی کے بعد سے مسلمان کچھ تقسیم وطن کی وجہ سے اور کچھ حکومتوں اور انتظامیہ کے رویے کی وجہ سے مدافعاتی اور معذرت خواہانہ رویہ اپناتے رہے۔ اب ہمارا وطیرہ بن گیا ہے کہ ہم صرف ان مسائل کے لئے کھڑے ہوتے ہیں جن کو ہم ''اسلامی'' مسائل سمجھتے ہیں اور یہ بھی صرف وقتی ہوتا ہے اور مسائل کا حق ادا نہیں کیا جاتا۔ یعنی اتمام حجت کے طور سے وہ مضبوط لٹریچر تیار کرنا جو وقتاً فوقتاً اٹھائے جانے والے مسائل اور اعتراضات کا مدلل جواب ہو اور انہیں زبانوں میں ہو جنہیں اعتراض کرنے والے یا ان سے متاثر ہونے والے بولتے اور پڑھتے ہوں مثلاً علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ، شریعت اور یونیفارم سول کوڈ، مسلمان حکمرانوں کے زمانے کے بارے میں گمراہ کن پروپیگنڈہ، مسلم آبادی میں اضافے کا دعویٰ، اردو، بابری اور دوسری مسجدیں، دہشت گردی وغیرہ کے بارے میں ہم نے برادران وطن کو صحیح معنوں میں آگاہ نہیں کیا۔ افسوس ہے کہ ان اور دوسرے تمام معاملات میں ہم اردو میں کچھ جذباتی تحریریں لکھ کر سمجھتے ہیں کہ مسائل کا حق ادا ہو گیا جبکہ ملک کے سواد اعظم کے ذہنوں میں یہ مسائل اور شبہات ویسے کے ویسے ہی باقی رہتے ہیں۔

اسی کے ضمن میں ہمارا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہم ملک میں چلنے والی سیاسی اور انسانی حقوق کی تحریکوں

سے کٹے رہتے ہیں۔ دوسروں مثلاً دلت، آدیواسی اور کمزور طبقات کے مظالم پر ہم خاموش رہتے ہیں۔ عمومی مسائل مثلاً شراب نوشی، جوا، سود، کرپشن، چائلڈ لیبر، عورتوں پر ظلم، نفرت کی سیاست، مہنگائی، ہر طرف پھیلی ہوئی غلاظت، کثافت، حقوق انسانی کی پامالی، کالا دھن، پولیس اور انتظامیہ کے مظالم، کسانوں کی موت، نیتاؤں کی لا قانونیت، جرائم وغیرہ کے بارے میں ہم بالکل خاموش رہتے ہیں اور پھر توقع رکھتے ہیں کہ جب ہم پر مظالم ہوں گے تو دوسرے باہر نکل کر ہماری تائید کریں گے۔ ظلم وزیادتی کے خلاف مظاہرے، دھرنے، کانفرنسیں وغیرہ ہمارے جمہوری حقوق کا حصہ ہیں۔ ہم نہ صرف عمومی اور دوسروں کے مسائل پر خاموش رہتے ہیں بلکہ جب خود ہمارے مسائل کے لئے دھرنے، کانفرنس اور مظاہرے ہوتے ہیں تو ہم غائب رہتے ہیں جس سے نہ صرف ہماری بے حسی کا پتہ لگتا ہے بلکہ دوسرے لوگ بالخصوص حاکم طبقہ یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو خود اپنے مسائل سے دلچسپی نہیں ہے لہٰذا کسی تبدیلی اور سدھار کی ضرورت نہیں ہے۔

ہمارے شہری، قانونی اور سیاسی حقوق کو مسلسل سلب کیا جارہا ہے۔ حکومتیں عوام کی پرواہ کئے بغیر پالیسیاں بنارہی ہیں اور ملک کو کارپوریٹ اور مغربی مفادات کے مطابق چلارہی ہیں لیکن ہم اپنے خواب خرگوش میں مست ہیں۔ اس صورت حال میں وہ دن دور نہیں جب ہم سے بولنے، لکھنے، چھاپنے اور مظاہرہ کرنے کے حقوق چھین لئے جائیں۔ ملک تیزی سے فاشسٹ بنتا جارہا ہے۔ گائے یا بیف کے نام پر پیٹ پیٹ کر ہلاک کرنا، لباس اور وضع قطع پر اعتراضات، قبرستانوں پر قبضے، شکل وصورت کی بنیاد پر بسوں اور ٹرینوں میں مسلمانوں پر حملے اسی آنے والے طوفان کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ہم کو اپنے مسائل پر اور ملک کے مسائل کے تئیں بھی سنجیدگی دکھانی ہوگی ورنہ فاشزم کا شکار سب سے پہلے ہم ہی ہوں گے۔

اب میں اس مسئلے کے تیسرے جزء پر آتا ہوں یعنی خود مسلمان اپنی سوسائٹی کی تعمیر کیسے کریں۔ آج ہماری صورت حال یہ ہے کہ ایک اقلیت کے علاوہ عامۃ المسلمین اسلام سے دور ہیں اور ان میں یہ شعور بھی موجود نہیں کہ وہ ایک ممتاز گروہ کا حصہ ہیں۔ بنی نوع انسان کے لئے آخری خدائی پیغام کے حامل مسلمانوں پر کچھ فردی اور کچھ اجتماعی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ فرد کے طور سے ہم کو ایک صالح اور اللہ پاک کے احکام کا فرماں بردار بننا ہے ورنہ ہماری اس دنیا میں بھی رسوائی ہوگی اور آخرت میں بھی۔ اس میں نماز، روزہ، زکوۃ، حج وغیرہ شامل ہے لیکن اسی کے ساتھ ہم کو اس ممتاز صالح کردار کا بھی حامل ہونا ہے جو مسلمانوں کو ممتاز بناتی ہے اور جس کی وجہ سے پرانے زمانے میں لوگ مسلمان کو دیکھ کر مسلمان

ہو جاتے تھے یعنی اعلیٰ ذاتی کردار کا حامل ہونا، جھوٹ، مکر و فریب، دھوکے، غیبت اور ظلم سے نفرت نیز معاشرے میں مثبت کردار کے ساتھ بحیثیت داعی کے جینا۔ اگر ہم دعوت و تبلیغ کے فریضے سے غافل ہوتے ہیں تو خدا کو ہماری ضرورت بالکل نہیں رہے گی۔ داعی کے لئے ناصح ہونا اور بہترین کردار کا حامل ہونا شرط ہے۔ بد کردار ہو کر دعوت دینا بے معنی ہے۔

اسی کے ساتھ ہم پر اجتماعی ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ ہم ہندوستان میں ایک چھوٹی سی اقلیت ہیں جو ۱۵ فیصد سے بھی کم ہے اور بالعموم بکھری ہوئی ہے۔ ہم کو اس ملک میں وہی طریقہ اپنانا چاہیے جو اقلیت کی حالت میں مسلمانوں نے مکہ میں قبل ہجرت، حبشہ میں اور پھر مدینہ میں ما قبل فتح مکہ اپنائی تھی۔ یعنی چھوٹے چھوٹے پوری طرح سے جڑے ہوئے گروہوں کی صورت میں رہنا جو آپس میں ایک دوسرے کی مدد اور خیر خواہی یعنی تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کرتے رہیں۔ اپنے بچوں کی دینی تعلیم کا گھروں پر یا مسجدوں میں انتظام، باہمی نزاعات کا آپس میں یا دار القضاء کے ذریعے فیصلہ کرانا، حکومت اور غیر مسلمین سے رابطہ کے لئے اشخاص اور اداروں کا تعین، مسلمانوں کے مفادات سے غداری کرنے والوں سے اجتناب اور ایسا کرنے والوں کا سماجی بائیکاٹ، تعلیم پر شدید توجہ، ذاتی اور اجتماعی زندگی میں صلاح و تقویٰ اور تجارت کو ملی پیشہ بنانا۔ یہ سب ہماری اپنی اجتماعی زندگی کی ضرورت ہیں اور ملک میں جگہ بنانے کے لئے بھی مطلوب ہیں۔ ہمارے پڑھے لکھے، متمول اور اچھی ملازمتوں پر فائز افراد اور تاجر لوگوں کی خصوصی ذمہ داری ہے کہ وہ مسلم سماج سے خود کو جوڑے رکھیں، اپنی ذمہ داریاں نبھائیں اور کمزوروں کا سہارا اور ڈھال بنیں۔ اب بھی وقت ہے کہ ہم جاگیں ورنہ ہماری حیثیت ہندوستان میں وہی ہو گی جو سینکڑوں سال حکومت کرنے کے بعد صقلیہ اور اندلس کے مسلمانوں کی ہوئی تھی۔

اخبار علمیہ

واقدی کے متعلق کتابیں اور جامعات کے تحقیقی مقالات

علم مغازی وسیر میں واقدی کو خاص مقام دیا جاتا ہے اور اس پر محققین نے بڑی توجہ دی ہے۔ ذیل میں واقدی پر چند شائع شدہ مقالات اور کتابوں کی ایک فہرست فاضل گرامی ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی نے ارسال کی ہے۔ اس سے واقدی کی عام مقبولیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:

۱۔الواقدی، مکانتہ العلمیۃ، منہجہ، موارده فی فتوح الشام، مؤلف، علی غانم، جثیر العبادی، اطروحۃ ماجستیر، جامعہ البصرہ۔ کلیۃ الآداب السنۃ۔ ۱۹۹۰ء۔ ۲۔الواقدی مکانتہ العلمیۃ، منہجہ فی کتاب المغازی، مؤلف، عکرمہ کامل محمد، مجلۃ دیالی للبحوث الانسانیۃ، ۲۰۰۹ء المجلہ، عدد ۳۵، صفحات۔ ۵۶۴-۶۰۶ ۔۳۔الواقدی وکتابہ المغازی، منہجہ ومصادره، مؤلف، عبدالعزیز بن سلیمان بن ناصر السلومی، اطروحہ، دکتوراہ، ناشر الجامعۃ الاسلامیۃ بالمدینۃ المنورة ۱۴۲۵ھ/۲۰۰۴ء صفحات ۹۲۰ ۔۴۔ منہج الواقدی ومصادره فی کتاب فتوح الشام: دراسۃ تاریخیۃ، منہجیۃ، مؤلف، جمعۃ عبد العزیز محمد ابو عنزة، صفحات: ۱۹۷ ۔۵۔ منہج الواقدی وموارده فی کتاب المغازی، مؤلف، محمد فضیل الکبیسی، اطروحہ دکتوراہ جامعۃ بغداد، کلیۃ الآداب، تاریخ النشر ۱۹۸۹ء/۱۴۰۹ھ ۔۶۔الواقدی ومنہجہ فی السیرة والطبقات، الجزء الاول، اشراف استاد الدکتور عبدالعزیز الدوری (یہ مقالہ جارڈن یونیورسٹی کی فیکلٹی آف پوسٹ گریجویٹ اسٹڈیز میں ماسٹر ڈگری حاصل کرنے کے لیے اگست ۲۰۰۰ء میں پیش کیا گیا تھا)۔۷۔الامام الواقدی فیمارمی بہ فی الحدیث والجواب عنہ، دراسۃ نظریۃ، اعداد دکتور یسری عجوز ۸۔ نجم المہتدی ببیان حال الواقدی، محقق: أ۔د۔ مرسی محمد حسن استاذ الحدیث وعلومہ بکلیۃ اصول الدین والدعوة، اسیوط۔۹۔ مرویات محمد بن عمر الاسلمی الواقدی فی الخلافۃ الراشدة فی تاریخ الطبری، جمع وتحقیق، رسالہ علمیۃ، اعداد الطالب/ نفیس احمد اصلاحی، مشرف ا۔د۔احمد بن حسین العقبی ۱۴۳۴-۱۴۳۵ھ۔ ۱۰۔الامام الواقدی ومنزلتہ بین الجرح والتعدیل، جمع واعداد، مساعد بن حامد بن زین آل ابراھیم الزھرانی۔ ۱۱۔الواقدی فی المیزان، اعداد الدکتور عالیۃ سلیمان سعید العطروز، دکتوراہ فی فلسفۃ علوم الحدیث الشریف/جامعہ الیرموک، استاذ مساعد بقسم الدراسات الاسلامیۃ بجامعۃ الامیر سطام بن عبد العزیز ۲۰۱۶ء۔ ۱۲۔ دراسۃ حدیثیۃ محمد بن عمر الواقدی فی نظر النقاد، د۔ الوردی زقادة، جامعہ باتنہ۔ عدد ۱۴۔ ۱۳۔حال الواقدی والمآخذ علیہ فی ضوء اقوال النقادفیہ، د۔سلطان سند العکایلہ، استاذ مشارک، قسم اصول الدین، کلیۃ الشریعۃ الجامعہ الاردنیۃ، المجلۃ الاردنیۃ فی الدراسات الاسلامیۃ، جلد ۹ عدد ۳، ۲۰۱۳ء۔ ۱۴۔الواقدی ومنہجہ فی کتاب سیرة النبی محمدؐ، أ۔د۔ریاض ہاشم ہادی، استاذ السیرة النبویۃ، کلیۃ العلوم الاسلامیۃ، جامعۃ الموصل، جلد ۳، عدد ۶، ۲۰۰۹ء۔ ۱۵۔الواقدی ومنہجہ فی کتابہ المغازی، ابوعبداللہ محمد بن عمر ابن الواقدی، اعداد، یاسر خصیر الحداد، المکتبۃ العصریۃ۔ ک۔ص اصلاحی

وفیات

مولانا سید محمد یحییٰ ندوی مرحوم

(۱۹۳۰۔۲۰۲۳ء)

گزشتہ دنوں کی ایک اندوہ ناک خبر مولانا سید محمد یحییٰ ندوی کی وفات کی ہے۔ مولانا یحییٰ ندوی مرحوم یقیناً اپنے رسوخ فی العلم خصوصاً علم حدیث میں تبحر، حافظہ، وسعت مطالعہ، دقت نظر اور اعلیٰ اسناد کی وجہ سے متبحر علماء میں مستثنیٰ شان کے حامل تھے۔ مولانا بہار کے مردم خیز خطہ مونگیر کے ایک گاؤں سانہہ میں ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئے۔ سادات سے تھے اور سید ابوالفرح واسطی کی نسبت سے واسطی تھے۔ ایک بار مکہ گئے تو ابن بحشل کی تاریخ واسط کی تلاش میں لگ گئے۔ ان کے محبوب مولانا حبیب الرحمن اعظمی نے فرمایا کہ جس مقصد سے کتاب خریدنا چاہتے ہو وہ اس میں نہیں ہے، یعنی آباء واجداد کے حالات اس کتاب میں نہیں ملیں گے، مولانا ندوی لکھتے ہیں کہ حضرت اعظمی کی یہ غیر معمولی ذکاوت اور ذہانت وفطانت تھی کہ محض کتاب کا نام لینے پر تاڑ گئے کہ اس کو خریدنے کا اصل مقصد کیا ہے۔

ان کے خاندانی بزرگوں میں کسی کو مذہبی اور علمی اوصاف کی وجہ سے خاصی بڑی جاگیر ملی تھی، لیکن اصل جاگیر تو علمی میراث تھی، ابتدائی تعلیم کے بعد قریب چودہ سال کی عمر میں وہ دارالعلوم ندوہ میں آ گئے، جہاں ان کو محدث شاہ حلیم عطا، مولانا ناظم ندوی، مفتی محمد سعید اعظمی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد عمران خاں ندوی جیسے نامور علماء و مشاہیر سے اکتساب فیض کا موقع ملا، مولانا سید سلیمان ندوی سے بھی تلمذ کا شرف حاصل ہوا، بعد میں مسلم یونیورسٹی میں انہوں نے مولانا عبداللطیف رحمانی، علامہ عبدالعزیز میمنی، مولانا بدرالدین علوی وغیرہ سے استفادہ کیا۔ ان کے علاوہ مولانا فضل اللہ رحمانی اور مولانا مناظر احسن گیلانی جیسے اصحاب فضل سے بھی وابستہ رہے، ان سارے مشاہیر کے ساتھ محدث کبیر مولانا حبیب الرحمن اعظمی سے ان کا رشتہ علم سب سے زیادہ دیرپا اور مستحکم رہا۔ مولانا اعظمی کی داستان، حیات ابوالمآثر کی دوسری جلد شائع ہوئی تو مولانا ندوی نے پیش لفظ میں لکھا کہ مولانا اعظمی سے ان کی نیاز مندی پچپن برس سے زیادہ کی ہے۔ اس طویل عرصہ میں وہ مولانا اعظمی سے قریب سے قریب تر ہوتے گئے اور خود علم حدیث میں کامل سے کامل تر ہوتے گئے۔ انہوں نے مولانا اعظمی کے ذکر میں لکھا کہ ان کے علم و معرفت اور فضل و کمال کا اندازہ لگانا بہت مشکل تھا، اخفائے حال اور شخصیت کے اظہار کے جذبہ سے قلب و جگر کے پاک ہونے کا انہوں نے ذکر کیا اور

لکھا کہ علم کی گہرائی و گیرائی دیکھنا ہو تو مولانا اعظمی کی تعلیقات بتائیں گی کہ بیہقی، دار قطنی ابن حجر اور ہیثمی سے اختلاف اور اپنے مضبوط دلائل کی وجہ سے ان کا قد متقدمین کے برابر ہی تھا، اب یہی بات خود مولانا یحییٰ ندوی کے بارے میں کہی جاسکتی ہے، ان کی گفتگو دراصل علم حدیث میں ان کی نہایت وسیع نظر اور اس سے کہیں زیادہ ان کی قوت حفظ کی ایسی تصویر بن جاتی تھی جو دیکھنے اور سننے والوں کو ابتدائی دور حدیث کے عالم میں پہنچادیتی، یقیناً وہ مجلسی بزرگ تھے لیکن دن کے وقت کا تین چوتھائی حصہ صرف کتابوں کے لیے وقف تھا۔ مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی نے ان کے کئی کاموں جیسے طیبی کی شرح الکشاف، ابن حجر کی اتحاف اور خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد میں وارد احادیث کی تدوین و تخریج کا ذکر کیا ہے۔ طبیعت میں بے نیازی زیادہ تھی کتابوں کی اشاعت میں بھی اس کا اثر ہوا۔ استغناء نے اظہار رائے میں مصلحت کی گنجائش ہی نہیں رکھی تھی۔ اسی لیے نجی محفلوں میں ان کی بے باکی، اللہ کے شیروں کی یاد دلادیتی۔ مولانا حبیب الرحمن اعظمی کی عقیدت ان کو بار بار مئو لے آتی۔ دارالمصنّفین کے کتب خانہ کی کشش ان کو کبھی کبھی اعظم گڑھ بھی لے آتی، یہاں چھوٹوں سے شفقت اور بے تکلفی کے لطف سے وہ آشنا کرجاتے۔ برسوں سے ان کا دیدار نہیں ہوا تھا لیکن بعض مخلصوں کی زبانی یہ سن کر فخر ہوتا کہ ان کی زبان پر کسی بہت چھوٹے اور نا اہل کا ذکر آجاتا تھا۔ اتفاق سے حال ہی میں فروری کے مہینے میں پٹنہ میں مولانا عبداللہ عباس ندوی مرحوم پر ایک سیمینار میں ان کی زیارت ہوئی، دور ہی سے دیکھ کر جس محبت سے نام لیا اور ساتھ ہی ایک دلچسپ جملہ بھی عجب کیفیت سے ادا کیا وہ واقعی پورے وجود کو سرشار کرگیا۔ وہیں مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی بھی تھے۔ ان سے بہتر سامع اور ہم نشین کون ہوسکتا تھا۔ محفل جمی اور پھر بیہقی اور قسطلانی بھی گویا بزم کی روح میں سما گئے۔ مولانا کو بس ہم دیکھتے رہے، کمزوری نمایاں تھی، ان کے صاحبزادے چاہتے تھے کہ مولانا ذرا خود کو آرام دیں۔ مولانا کو لے کر رخصت ہوگئے۔ اور مولانا ہمیشہ ہمیشہ کے آرام کے لیے اس دنیائے دنی ہی سے رخصت ہوگئے۔ یہ رمضان المبارک کی سولہویں اور اپریل کی آٹھ تاریخ تھی۔ زندگی بھر یا یحیٰ خذالکتاب بقوۃ کی عملی تفسیر بننے والے کے لیے بطور تیمن کہہ سکتے ہیں سلام علیہ یوم ولد ویوم یموت ویوم یبعث حیا۔ ع۔ ص

تبصرۂ کتب

مسلم خواتین کے معاشی وسماجی حقوق واختیارات: غلط فہمیوں کا ازالہ: ڈاکٹر تمنا مبین اعظمی، کاغذ وطباعت عمدہ، غیر مجلد مع خوبصورت گرد پوش۔ صفحات: ۱۹۴۔ ملنے کا پتہ: ماڈرن اسٹیشنری اینڈ پرنٹ سولوشن کے ۹۶ ٹھوکر نمبر ۵، ابوالفضل انکلیو پارٹ ۱، جامعہ نگر، اوکھلا نگر، نئی دہلی ۲۵۔ قیمت: ۲۶۰ روپے۔ سن طباعت: ۲۰۱۹ء۔ موبائل ۹۵۶۰۹۸۵۱۳۰ (tmazmi85@gmail.com)۔

عورتوں کی قدرتی ساخت، اس کی نفسیات، اس کی ذاتی حیثیت، اس کے علمی، تعلیمی معاشی، سماجی اختیارات اور اس کے مالکانہ حقوق پر بحث و تحقیق کی روایت بہت قدیم ہے۔ دوسرے ادیان ومذاہب اور تہذیبوں میں عورتوں کے مقام و مرتبہ کے تعین اور سماجی و معاشی حقوق و اختیارات کے تقابلی مطالعہ و تجزیہ سے خود اسلامی تاریخ کے صفحات بھی بھرے پڑے ہیں۔ ایسے میں یہ کتاب اس لیے اہم ہے کہ اس میں مسلم عورتوں کے معاشی وسماجی حقوق واختیارات کے متعلق خاص طور سے جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں ان کی محققانہ تردید کی گئی ہے۔ مصنفہ کا یہ خیال ان کے اس موضوع پر سنجیدہ مطالعہ اور وسعت تحقیق پر مبنی معلوم ہوتا ہے کہ ہر زمانہ میں عورت کی حق تلفی اور اس کے ساتھ بے اعتدالی کی گئی۔ جب اس کو قید کر کے رکھا گیا تب بھی اور مساوات کے نام پر جب اس کو مردوں کے شانہ بشانہ کھڑا کیا گیا تب بھی اس کے ساتھ بے اعتدالی اور شدت موجود ہے۔ (ص ۱۲) مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مصنفہ دیگر مذاہب اور تہذیبوں میں عورتوں کی سماجی حیثیت سے غیر مطمئن مگر اسلام میں دیے گئے عورتوں کے حقوق واختیارات پر مطمئن ہیں۔

عورت مختلف تہذیبوں میں، عورت اسلام کی نظر میں، مسلم خواتین کے معاشی اور اس کے سماجی حقوق واختیارات کے عنوان سے کتاب کو چار ابواب میں منقسم کر کے مواد کو سلیقہ سے پیش کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں مختلف مذاہب میں عورت کی حیثیت اور اس کے حقوق کا جائزہ لیتے ہوئے اسلام میں عورت کی حیثیت واضح کی ہے۔ دوسرے باب میں اسلام کے نظریۂ مساوات اور بحیثیت انسان دونوں کے حقوق کا تجزیہ کرتے ہوئے بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کیا گیا ہے۔ تیسرے میں مسلم عورتوں کے حقوق میراث، نفقہ اور معاشی سرگرمیوں کی اجازت کا مفصل ذکر ہے۔ چوتھے میں ان کے شخصی، معاشرتی حقوق واختیارات اور آخر میں ایک فصل میں مسلم عورتوں کے متعلق مخالفین اسلام کے چند اعتراضات مثلاً اسلام میں عورت کو قیادت کے لیے نااہل، اس کو ناقص العقل، ٹیڑھی پسلی سے پیدائش، مردوں کی عورتوں پر حاکمیت، میراث میں نصف حصہ اور ایک مرد کے مقابلہ میں

دو عورت کی گواہی تسلیم کرنے کا ناقدانہ جائزہ لیا گیا ہے اور ہر اعتراض کا مدلل جواب دینے اور اسلام کے موقف کی صحیح ترجمانی کی کوشش کی گئی ہے۔اسلوب سادہ و دلنشین ہے۔ بعض پامال مواد و مشمولات میں مصنفہ نے اپنی تحقیقی بصیرت سے جان ڈال دی ہے۔ کوئی بات حوالہ کے بغیر نہیں کہی گئی ہے۔اس اہم اور مفید کتاب کے لیے مصنفہ ہدیۂ تبریک کی مستحق ہیں۔

اظہار واعتراف: ڈاکٹر آفاق فاخری، کاغذو طباعت عمدہ مجلد مع خوبصورت گرد پوش۔ صفحات: ۱۴۸۔ ملنے کا پتہ: محلہ قاضی پورہ، جلال پور ضلع امبیڈکر نگر۔ قیمت: ۱۵۰روپے۔ سن طباعت: ۲۰۱۹ء۔ موبائل نمبر: ۹۹۱۸۶۱۷۵۷۶۔ ای میل: درج نہیں۔

فیض احمد فیض، احمد فراز، شکیل بدایونی، علی جواد زیدی، کرامت علی کرامت، شرف الدین ساحل، عامر قدوائی، شارق عدیل، احسن رضوی، نفیس دسنوی جیسے ممتاز ترقی پسند شعرا کی نظموں اور غزلوں کے اوصاف اور ملک زادہ منظور احمد، شکیل الرحمن، انور جلال پوری، نسیم بن آسی میں بعض کے اسلوب نگارش اور بعض کی افسانہ نگاری کے خصوصیات کا تنقیدی جائزہ اس کتاب میں لیا گیا ہے۔ایک مضمون میں احسن رضوی کے شعری مجموعہ شام سے پہلے پر تبصرہ بھی ہے۔آخر میں تاثرات کے عنوان سے اپنے متعلق مشہور اہل علم کے آرا بھی درج کیے ہیں۔ مصنف کے بقول یہ تمام مضامین ملک و بیرون ملک کے مختلف رسائل و جرائد میں چھپ چکے ہیں۔اس طرح شائقین کی ادبی تشنگی کا سامان پہلے ہی کیا جاچکا ہے لیکن جن رسائل و جرائد میں یہ مضامین چھپے ہیں ان کی نشان دہی زیر نظر مجموعہ میں نہیں کی گئی ہے۔

مذکورہ بالا نامور سخنوروں اور ادیبوں کی نظر بالعموم موجودہ زندگی کے معاشرتی خدوخال اور سیاسی میلانات ورجحانات پر یقیناً بڑی گہری تھی۔انہوں نے بامقصد اور تعمیری ادب پر توجہ مرکوز کی تھی۔ان کی شعری تخلیقات اور نثری نمونوں میں فنی خوبیوں اور ادبی لطافتوں کے ساتھ ساتھ ان کا وہ وصف قدر مشترک کے طور پر نظر آتا ہے جس سے قاری کے فکری جمود کو متحرک اور اس کو نئے انقلاب سے آشنا ہونے کا موقع ملتا ہے۔مصنف نے ان شاعروں اور ادیبوں کے تنقیدی جائزہ میں ان کے اس پہلو کو ابھارنے کی خاص طور پر کوشش کی ہے اور بیشتر میں وہ کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔اس ضمن میں ان کی ناقدانہ بصیرت کا جوہر کھل کر نظر آتا ہے۔

مصنف خود عمدہ شاعر اور ناقد ہیں۔ان کے کلام میں قدیم وجدید لب ولہجہ کی آمیزش کا منفرد رنگ موجود ہے، اس لیے شاعرانہ اوصاف کی تراوش اور اسلوب نگارش اور نثری خوبیوں کی تلاش و تفحص

میں ان کی مہارت پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۵ شامل مضامین میں بیشتر دس سے بھی کم صفحات پر مشتمل ہیں۔ مضامین کے ایجاز و اختصار کی خوبی اپنی جگہ لیکن تشنگی کا احساس کچھ اور کا تقاضہ بھی کرتا ہے۔ کتاب ادب شناسوں کے مطالعہ کے لائق ہے۔

ترسیل و تفہیم: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۱۴۴، ملنے کا پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔ قیمت: ۲۵۰ روپے۔ سن طباعت ۲۰۲۰ء۔ موبائل نمبر: ۹۴۳۰۹۶۶۱۵۶ ای میل: (info@ephbooks.com)۔

ماں: اردو شاعری میں، اردو شاعری میں واقعیت اور جمہوریت کا آغاز (مجنوں گورکھپوری اور نظیر اکبرآبادی کے حوالہ سے)، خطوط غالب کی اہمیت، اردو افسانچے کی ہمہ گیری، منٹو نامہ: پوسٹ مارٹم، کلیم الدین احمد اور الفاظ اور شاعری کی تخلیقیت شناسی، وزیر آغا: مصنف، متن اور قاری کا رشتہ، خاکہ نگاری کا فن اور محمد طفیل، وغیرہ متفرق عناوین پر کل بارہ ادبی مضامین اس کتاب میں شامل ہیں۔ یہ سب مضامین اور محمد سالم کی انگریزی کتاب پر مصنف کا تعارف و تبصرہ ان قارئین کے لیے خاصے کی چیز ہے جن کا ذوق مطالعہ جدید بالخصوص ساختیاتی ادب سے مانوس ہے۔ اس لیے کہ مخصوص مناسبت کے بغیر اس ادب کو سمجھنا آسان نہیں۔ بعض مضامین کلاسیکل اردو ادب کی روایتوں کے حامل بھی ہیں۔ پہلے مضمون کی ابتدا میں ماں میں شامل ہر حرف کا الگ الگ یعنی م سے محبت، الف سے ایثار اور نون سے نازکی کا مفہوم نکالتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ لفظ ماں میں جو راحتیں ہیں وہ خدا کی رحمتیں ہیں۔ (ص۶) اس بیان کی صداقت سے انکار مشکل ہے۔ خطوط غالب کی ادبی اہمیت میں کسی خاص پہلو کی طرف نشان دہی نہیں کی گئی ہے۔ زیادہ تر مضامین جامعیت اور تنقیدی شان کے لحاظ سے اعتدال کا انداز لیے ہوئے ہیں۔ قتیل شفائی کی غزلوں کے مسائل اور حامدی کاشمیری کی تنقید میں شعری کائنات کا احاطہ و تجزیہ بھی خوبی سے کیا گیا ہے۔

صاحب کتاب کا شمار اردو کے نام ور اور معروضی نقطۂ نظر کے حامل ادیبوں اور نقادوں میں ہوتا ہے۔ ادبی مضامین میں تحقیقی مقالات کی طرح حوالوں کا اہتمام کم ہی کیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں بھی یہی کیا گیا ہے لیکن کم از کم آیات و احادیث کے حوالے اور اردو خواں طبقہ کے لیے انگریزی کے بعض لمبے اقتباسات کے ترجمے کتاب کی افادیت میں اضافہ کا سبب ہو سکتے تھے۔ **ک ص اصلاحی**

سہ ماہی زاویہ، انجمن طلبۂ قدیم مدرسۃ الاصلاح کا ترجمان (جنوری تا مارچ ۲۰۲۳) پتہ: شعبۂ نشر و اشاعت انجمن طلبۂ قدیم مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ، ۲۷۶۳۰۵، زر تعاون فی شمارہ:

۴۰۰روپئے۔

مدرستہ الاصلاح کا شمار برصغیر کی مشہور درسگاہوں میں ہوتا ہے۔اس کے قیام کو اب ایک سو پندرہ (۱۱۵)سال ہو رہا ہے۔اس کا ترجمان ''الاصلاح'' اپنے عہد کا مشہور رسالہ تھا۔اس کے مدیر مولانا امین احسن اصلاحیؒ تھے۔اس کے بند ہو جانے کے کافی عرصے بعد ''نظام القرآن'' سہ ماہی کا اجرا ہوا، جو بڑی پابندگی سے شائع ہو رہا ہے۔البتہ ''انجمن طلبۂ قدیم مدرستہ الاصلاح'' کا قیام ۱۹۴۰ء کے اوائل میں عمل میں آیا تھا، جس کے پہلے صدر مولانا امین احسن اصلاحیؒ تھے، مگر انجمن مولانا اصلاحی کے پاکستان ہجرت کے بعد زیادہ سرگرمِ عمل نہ رہ سکی۔اس کے بعد ۱۹۶۰ء کے آغاز میں اس کی نشاۃ ثانیہ ہوئی تو مولانا بدرالدین اصلاحیؒ سابق ناظم مدرستہ الاصلاح اس کے صدر اور مولانا غالب احسن اصلاحیؒ جنرل سکریٹری بنائے گئے۔

اس انجمن کا اب تک کوئی باقاعدہ ترجمان نہ تھا،البتہ اس کی شاخِ دھلی سے ''نقش'' سالانہ اور شاخِ ممبئی سے ''ندائے مدرستہ الاصلاح'' سہ ماہی شائع ہوتا ہے۔سہ ماہی زاویہ اسی کا ترجمان ہے۔اس کا اجرا مارچ ۲۰۲۳ء میں مدرسے ہی میں بڑے اہتمام سے ہوا۔اس موقع پر ناظمِ مدرسہ، کارکنان کے علاوہ بڑی تعداد میں متعلقینِ مدرسہ اور مہمان خصوصی میں جناب عالم بدیع اعظمی اور جناب ڈاکٹر حفظ الرحمن اصلاحی صاحبان وغیرہ موجود تھے۔

اس رسالے کے مدیر محمد مرسلین اصلاحی ہیں۔اس میں کافی تنوع ہے۔ مثلاً اس میں اداریہ، فکر و نظر،اخبار انجمن، بزم رفتگاں،ادبیات، رپورتاژ جیسے کالمز ہیں۔اس شمارے کے مضامین و مقالات کچھ اس طرح سے ہیں : مدرستہ الاصلاح کا نصب العین،انجمن طلبۂ قدیم : ایک تعارف،انجمن کے اہداف و مقاصد از مولانا ابوالفیض مدنی مرحوم اور مدرستہ الاصلاح: احوال و کوائف وغیرہ۔

مجموعی لحاظ سے رسالہ معیاری ہے۔رابطے کے لیے نہ تو کوئی موبائل نمبر اور نہ ہی کوئی ای میل ایڈریس دیا گیا ہے

(فضل الرحمن اصلاحی)

ادبیات

(حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے سانحہ ارتحال سے متاثر ہو کر)

وارث ریاضی۔ موبائل: ۸۲۲۸۹۰۲۵۴۸

اے امامِ علم و عرفاں داعیِ امن و اماں
تیری رحلت پر جہانِ علم ہے محوِ فغاں
تیری ہستی تھی فروغِ دین و ایماں کی دلیل
آئینہ دارِ شریعت تیرا کردارِ جمیل
قحطِ دانش میں کہیں ملتا نہیں تیرا بدل
سوگ میں ڈوبا ہوا ہے مرکزِ[1] علم و عمل
تو سراپاے تدبر ، جانشینِ بو[2] الحسن
صاحبِ لوح و قلم اے نازشِ قوم و وطن
اے خطیب عہد نَو ! اے ناقدِ بالغ نظر
کاشفِ اسرارِ قرآں، شارحِ وحی و خبر
تیری فرقت میں حزیں شبلی[3] کی بزم علم و فن
تیرے غم میں مضمحل فکر و نظر کی انجمن
حضرت سید[4] کی فکر و آگہی کا ترجماں
تو عمیرِ[5] نیک دل کے علم و فن کا قدرداں
ہیں ظفر[6] خاں بھی جدائی میں تری ماتم گسار

---

[1] ندوۃ العلماء لکھنو

[2] مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

[3] دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

[4] مولانا سید سلیمان ندویؒ

[5] مولانا محمد عمیر الصدیق ندوی

[6] ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں صاحب، ناظم دارالمصنّفین

فضل[۷] رحمان و کلیم[۸] و فخر[۹] بھی ہیں بے قرار
چھپ گیا حکمت کا مہرِ ضوفشاں جانے کہاں؟
اب کہاں دیکھیں گی آنکھیں اس کے قدموں کے نشاں
بیس سو تیئس میں اے وارثِ گریہ کناں
حضرت رابع بھی دنیا سے گئے سوے جناں

غزل

خالد ندیم

dr.khalidnadeem@gmail.com

جب دیکھو کبھی وقت کو رفتار بدلتے
اپنے بھی نظر آئیں گے گفتار بدلتے

شاید تمھیں دنیا کی سمجھ بوجھ نہیں ہے
حالات بدلنے سے ہیں کردار بدلتے

گر اپنے بدلنے سے بدل سکتی یہ دنیا
اپنے تیئں اک دو نہیں، سو بار بدلتے

خوش فہم تھے ایسے کہ توقع ہی نہ توڑی
ورنہ کہاں گلزار میں ہیں خار بدلتے

خود ہی کو بدلنا پڑا آخر کو ، الٰہی !
کتنا تری دنیا کو یہ لاچار بدلتے

پنجاب کے باسی ہیں ، وفاؤں کے امیں ہیں
ہم وقت بدلنے سے نہیں یار بدلتے

جس درجہ سہولت سے بدل جاتے ہیں واعظ
اس طور نہیں کیوں یہ گنہگار بدلتے

لشکر ہی بدلتے رہے پسپائی پہ ہر بار
لیکن یہ نہ سوچا کبھی ، سالار بدلتے

امید پہ بیٹھے رہے ہم اچھے دنوں کی
اور وہ رہے آپس ہی میں دستار بدلتے

ملاح کی نیت تو ، ندیم ! آج کھلی ہے
طوفاں میں رہے ہم یونہی پتوار بدلتے

---

[۷] مولانا فضل الرحمن اصلاحی

[۸] ح مولانا کلیم صفات اصلاحی

[۹] ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی، ڈپٹی ڈائرکٹر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

معارف کی ڈاک

(معارف مارچ ۲۰۲۳) بہت بھرپور اور شاندار شمارہ ہے۔

سلیم منصور خالد (مدیر ترجمان القرآن، لاہور)
123ubm@gmail.com

دینی مضامین کے بارے میں بعض قارئین کا نقطۂ نظر

اردو رسائل میں ''معارف'' کا اپنا ایک منفرد مزاج ہے، اجراء کے زمانہ ہی سے اس کے مشتملات کی خصوصیاتیہ رہی ہیں: موضوعات میں تنوع، فکری توسع، قدیم وجدید میں امتزاج، علمی و تحقیقی اندازِ بیان، نقد و استدراک میں اعتدال، مناسب انداز میں اظہارِ رائے کی آزادی۔ یہ بھی معروف ہے کہ مذہب و ثقافت، دینی افکار و تعلیمات، علمِ قرآن، حدیث و فقہ، سیرتِ نبوی ﷺ و تاریخِ اسلامی، فلسفہ و علمِ کلام، شعر و ادب، امورِ معاشرت و معیشت، سیاست و حکومت سے متعلق موضوعات پر علمی نگارشات اس کے مشتملات کا حصہ بنتی رہی ہیں اور قارئینِ با تمکین اپنے ذوق اور اپنی پسند کے مطابق اس کے مضامین سے فیضیاب ہوتے رہے ہیں۔ ان حقایق کے پس منظر میں مارچ ۲۰۲۳ء کے شمارہ کے اولین مراسلہ میں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ دینی مضامین کو (کلامی مضامین کے ساتھ جوڑ کر) خشک قرار دیتے ہوئے فاضل مراسلہ نگار نے یہ تحریر کیا ہے کہ ''خشک دینی اور کلامی مضامین کی جگہ تر و تازہ ادبی مقالات کی وجہ سے اس دفعہ سارا معارف پڑھ لیا'' (معارف، مارچ ۲۰۲۳ء، ص ۲۴۷)۔ اس ضمن میں یہ ذکر بر محل معلوم ہوتا ہے کہ ''معارف'' کے بہت سے قارئینِ کرام اس کی ''خشکی'' پر اپنا احساس اولین مدیرِ محترم مولانا سید سلیمان ندویؒ کے دور میں بھی ظاہر کرتے رہتے تھے اور سید صاحب ان کے جواب میں شذرات میں کچھ نہ کچھ تحریر فرماتے تھے، اس کا ایک نمونہ جولائی ۱۹۲۸ء کے شذرات کے حوالے سے ملاحظہ ہو: ''معارف کے احباب محبت کی راہ سے اب کبھی کبھی اس کے مسلک پر نکتہ چینی بھی کرتے ہیں اور اس کی خشکی کے شاکی تو اکثر نکلیں گے، لیکن ہر سال ہمیں یہی کہنا پڑتا ہے کہ ہنسنے ہنسانے والوں کی تو کمی نہیں، ان کی محفل میں بیٹھ کر دل بہلا لیجیے، لیکن آخر سوچنے سمجھانے والے مشیر کی بھی آپ کو حاجت ہے یا نہیں'' (معارف، ۲۲،۱، جولائی ۱۹۲۸ء، ص ۲-۳؛ شذراتِ سلیمانی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۶ء، ۲، ۱۷۴-۱۷۵)۔

بہر حال یہ افسوس کا مقام ہے اور لمحۂ فکریہ بھی ہے کہ دینی مضامین یا مذہبی موضوعات پر تحریروں کے بارے میں ہمارا نقطۂ نظر کیا ہوتا جارہا ہے۔ اللہ رب العزت ہمیں فکر و عمل کی صالحیت نصیب فرما

ئے اور دین و علمِ دین کی خدمت کی توفیق عنایت کرے۔ آمین ثم آمین۔

پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی
اسلام منزل، اقرا کالونی، علی گڑھ
zafarul.islam@gmail.com

جناب زاہد جعفری کا مکتوب

معارف دسمبر ۲۰۲۲ء میں راقم الحروف کے ایک شائع شدہ مکتوب کے رد عمل میں مارچ ۲۰۲۳ء کے معارف میں جناب زاہد جعفری صاحب کا مکتوب باصرہ نواز ہوا جس میں موصوف نے مدیر معارف کے بجائے ناچیز سے خطاب کیا ہے۔

معارف جولائی ۲۰۲۲ء کے شمارے میں ڈاکٹر راہی فدائی صاحب نے اپنے مکتوب میں محمد بن اسحاق یسار (۸۵ھ۔۱۵۰ھ) کو متنازعہ فیہ راوی حدیث قرار دیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ محدثین اور ائمہ فقہ کی ایک جماعت نے ابن اسحاق کو ایک متنازع اور متضاد افکار و نظریات کا حامل راوی حدیث قرار دیا ہے۔ ایسے میں اگر ڈاکٹر راہی فدائی صاحب نے ابن اسحاق کو متنازع فیہ راوی حدیث کہہ دیا تو انھوں نے کون سی خطا کردی کہ ان کی تنقید کو زاہد صاحب نے تنقیص کے زمرے میں شامل کرکے اکتوبر ۲۰۲۲ء کے معارف میں ایسے ایسے تبرا کے کرتب دکھائے ہیں کہ:

ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے

اب جب کہ زاہد جعفری صاحب نے اپنے مسلک کا برملا اظہار کردیا ہے تو پھر ان کے زیر بحث مکتوب کی ہر ہر شق پر بحث کار عبث ہے۔ پھر بھی چند بنیادی باتوں کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا۔

۱۔ جب خوارج نے حضرت علیؓ کو سودَ اللہ وَجْہہٗ کہنا شروع کردیا تو اس کے جواب میں شیعانِ علی نے حضرت علیؓ کو کرّم اللہ وَجْہہٗ کے خطاب سے نوازا۔ زاہد صاحب کے بہ قول "کرم اللہ وجہہ" الٰہی خطاب ہے تو وہ بتائیں کہ یہ خطاب قرآن عزیز کی کس سورہ میں ہے؟

زاہد صاحب "رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ" کو ایک دعا قرار دیتے ہیں حالاں کہ یہ ایک بشارت ہے جو قرآن حکیم کی سورہ مائدہ (آیت نمبر ۱۱۹)، سورہ توبہ (آیت نمبر ۱۰۰)، سورہ مجادلہ (آیت نمبر ۲۲) اور سورہ بینہ کی آیت نمبر ۸ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دی گئی ہے۔ مولانا محمد یوسف بنوری (۱۹۰۸ء۔ ۱۹۷۷ء) خلافت وملوکیت کی تاریخی وشرعی حیثیت کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں:

صحابہ کرامؓ کو بار بار رضی اللہ عنہم و رضوعنہ (اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے) کی بشارت دی گئی ہے۔ اور امت کے سامنے اس شدت و کثرت سے دہرایا گیا ہے کہ یہ لقب امت کا تکیہ کلام بن گیا۔۔۔۔۔ اور کسی صحابی رسولؐ کا نام نامی رضی اللہ عنہ کے بغیر مسلمان کی زبان پر جاری نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالی صرف ظاہر کو دیکھ کر راضی نہیں ہوا اور نہ صرف ان کے کارناموں کو دیکھ کر بلکہ ان کے ظاہر و باطن اور حال و مستقبل کو دیکھ کر راضی ہوا، یہ گویا اس بات کی ضمانت ہے کہ آخر دم تک ان سے رضائے الٰہی کے خلاف ظاہر نہیں ہوگا۔[1]

قرآن حکیم نے صحابہ کرامؓ کے ایمان کو معیار حق قرار دیتے ہوئے ان پر انگشت نمائی اور لب کشائی کرنے والوں پر نفاق و سبائیت کی دائمی مہر ثبت کردی ہے: وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ (البقرہ: آیت ۱۳) (اور جب ان (منافقین) سے کہا جاتا ہے کہ ان پر ایمان لاؤ، جس طرح سب ایمان لائے تو کہتے ہیں کیا ہم ایمان لائیں جس طرح لائے بے وقوف، جان لو! وہی بے وقوف ہیں لیکن نہیں جانتے)۔

۲۔ زاہد صاحب نے انا مدینۃ العلم وعلی بابھا سے حضرت علیؓ کی افضیلت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ (معارف مارچ ۲۰۲۳ء ص ۷۷)۔ یہ حدیث حاکم کی مستدرک میں ہے۔ اس حدیث کے متعلق محدث عصر مولانا محمد یونس جون پوریؒ (۱۹۳۷ء۔۲۰۲۰ء) لکھتے ہیں: ھو حدیث مختلف فیہ فحکم جماعۃ کا بی زرعہ الرازی و ابن عدی و مطین و ابن حبان بانہ باطل، ومال الیہ احمد بن حنبل و حکم علیہ ابن الجوزی بالوضع۔[2] (وہ حدیث (انا مدینۃ العلم ۔۔۔۔۔) مختلف فیہ ہے۔ ایک جماعت جس میں ابو زرعہ رازی ابن عدی مطین اور ابن حبان شامل ہیں، ان کے نزدیک وہ حدیث باطل ہے، یہی رجحان امام احمد بن حنبل کا ہے اور ابن الجوزی نے اس حدیث کو موضوع قرار دیا ہے)۔ لہذا درج بالا حدیث سے حضرت علیؓ کی افضیلت ثابت کرنا محل نظر ہے۔

۳۔ زاہد صاحب کے اس بات سے بھی اتفاق نہیں کہ تنقید و تنقیص کا دار و مدار نیت پر ہے۔ "تنقید" کسی فن پارے کو فن کی کسوٹی پر پرکھنے کا نام ہے جس میں فن پارے کے محاسن اور اسقام زیر بحث

---

[1] حافظ صلاح الدین یوسف ایڈیٹر الاعتصام لاہور، خلافت و ملوکیت کی تاریخی و شرعی حیثیت، مکتبہ ترجمان دہلی۔ ص ۵۷

[2] مولانا محمد یونس جون پوریؒ الیواقیت العالیہ جلد دوم مکتبہ ابوالحسن سہارنپور ص ۳۳۹۔ حدیث نمبر ۲۶۵۵

آتے ہیں۔ اور کسی فرد پر تنقید کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ تعصب سے بالاتر ہو کر اس کی وہی کمزوریاں دکھائی جائیں جو اس میں پائی جاتی ہوں۔ تنقیص میں عمداً کسی شے یا کسی شخص کو کم تر یا گھٹیا ثابت کیا جانا ہے۔ جہاں تک نیت کی بات ہے تو نیت دل کے ارادے کا نام ہے۔ اور دل میں کیا ہے؟ وہ بات تو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، اس طرح تنقید و تنقیص میں نیت کا کچھ بھی دخل نہیں ہے۔

حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ پر کیا تنقید کی، یہاں معلوم نہیں ہے، لیکن یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ کسی نامناسب بات پر ٹوکنا یا تنبیہ کرنا تنقید نہیں ہے۔

یہ بات بھی درست نہیں ہے کہ جذبۂ تنقید فرشتوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ فرشتوں کی کیا مجال کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور چوں وچرا کہہ سکیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں اپنا نائب (خلیفہ) پیدا کرنا چاہتا ہوں تو فرشتوں نے بہ طور استفسار عرض کیا کہ اتجعل فیھا من یفسدفیھا ویسفك الدماء -(البقرہ آیت نمبر ۳۰) (باری تعالیٰ! کیا آپ زمین میں ایسی مخلوق پیدا کریں گے جو اس میں فساد مچائے اور خون خرابہ کرے۔۔۔)

فرشتوں کا یہ کوئی اعتراض نہیں تھا۔ انسان سے پہلے جنات پیدا کئے گئے تھے۔ جنات کا آپس میں فتنہ و فساد اور خوں ریزی کا مشاہدہ فرشتوں نے کیا تھا۔ چنانچہ فرشتوں نے سوچا کہ انسان کا انجام بھی شاید ایسا ہی ہو۔ یہ کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ استفسار تھا جسے ناواقفیت کی بنیاد پر تنقید سمجھ لیا گیا۔

۴۔ تاریخ شاہد ہے کہ خلیفہ سوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ (وفات ۳۵ھجری) کو عبداللہ بن سبا اور اس کے بد معاش گروہ نے شہید کیا۔[3]

۵۔ جنگ جمل میں تقریباً دس ہزار اور جنگ صفین میں قریب ایک لاکھ آدمی کام آئے۔ یہ دونوں جنگیں ابن سبا اور اس کے دہشت گردوں کی سازشوں کے نتیجے میں برپا ہوئیں۔[4]

مولانا محمد اسحاق ندوی سندیلوی (۱۹۱۳ء۔۱۹۹۵ء) رقم طراز ہیں:

> ''سبائیت''، شیعیت کی صورت میں نمایاں ہوئی، لیکن فتنہ انگیزی کی ضرورت پڑنے پر اس نے خارجیت کا لباس بھی پہن لیا۔ موقع ہاتھ آیا تو اعتزال کی عبا میں رقص کو پنہاں کیا۔ کبھی باطنیت کا خرقہ پہن کر خانقاہوں کے ذریعہ ظلمت وضلال پھیلانے کی کوشش کی۔ عبداللہ بن سلول

---

[3] مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی، ہماری بادشاہی دارالمصنّفین اعظم گڑھ ص ۴۶ تا ۵۲

[4] ماخذ سابق ص ۵۷، ۵۸

نے جو پودا لگایا تھا اور جس کی آبیاری عبداللہ بن سبا نے کی۔ اس میں بہت سی شاخیں پھوٹیں، مگر رفض سب میں مشترک رہا اور سچ یہ ہے کہ اسلام میں جتنے فتنے آج تک پیدا ہوئے ہیں سب کی اصل یہی فتنۂ سبائیت ہی ہے۔۔۔۔۔

ابن سبا کے بعد مختلف ادوار میں اس پارٹی میں ایسے افراد پیدا ہوتے رہے جو اپنے ماحول کے لحاظ سے اس فتنے میں تجدید و تقویت کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ فتنہ آج تک باقی ہے اور اس نے جس قدر نقصان مسلمانوں کو دین و دنیا کے اعتبار سے پہنچایا ہے اس کا عشر عشیر بھی غیر مسلموں سے نہیں پہنچ سکا۔[۵]

۶۔ زاہد جعفری صاحب نے اپنے دونوں زیر بحث مکتوب میں حضرت عمار یاسرؓ، حضرت حذیفہ بن ثابتؓ، حضرت اویس قرنیؒ کے قتل پر سوالیہ نشان لگائے ہیں، لیکن حیرت ہے اور افسوس بھی کہ زاہد صاحب کو وہی شہید صحابہؓ یاد آئے جو حضرت علیؓ کے موافقین میں شامل تھے، لیکن حضرت عائشہؓ کی فوج میں شامل حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ یاد نہیں آئے۔ جب کہ حضرت طلحہؓ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "طلحہؓ زمین پر چلنے والا شہید ہے"۔ اور حضرت زبیرؓ کے بارے میں خود حضرت علی کی روایت ہے: زبیر کا قاتل جہینہ میں ہے۔[۶] حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ کو رتبہ صحابیت بھی حاصل ہے اور شرف شہادت بھی، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ دونوں صحابہ عشرۂ مبشرہ میں شامل ہیں۔

موصوف نے حضرت عائشہؓ کے بارے میں لکھا ہے کہ: ان کو امیر معاویہ نے زندہ در گور کرادیا (معارف مارچ ۲۰۲۳ء ص۷۹)۔ تاریخ اسلام کا یہ سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ زاہد صاحب نے اس سلسلے میں سیوطی، ترمذی اور کامل ابن اثیر کے حوالے دیے ہیں جن میں جلد صفحات اور مطابع نہیں لکھے گئے ہیں۔ ویسے بھی ان کتابوں میں حضرت عائشہؓ کے زندہ در گور کیے جانے کا ذکر نہیں ہے۔

سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندویؒ (۱۸۸۴ء۔۱۹۵۳ء) نے سیرت عائشہؓ میں حضرت عائشہؓ کے زندہ در گور کیے جانے کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ ایسی کوئی روایت ہوتی تو اس پر سید صاحبؒ ضرور کچھ لکھتے۔

۷۔ زاہد جعفری صاحب کا دعویٰ ہے کہ حضرت عثمانؓ کو اقتلوا نعثلا کے نتیجے میں قتل کیا گیا (معارف

---

[۵] مولانا محمد اسحاق سندیلوی ندویؒ، تجدید سبائیت حصہ اول ادارہ نظام کرنیل گنج کان پور ص۱۶و۱۷۔

[۶] مفتی محمد شفیعؒ معارف القرآن جلد ۸ کتب خانہ نعیمیہ دیوبند ص ۱۱۲۔۱۱۳

مارچ ۲۰۲۳ء ص ۷۹)۔ نعثل کے معنی آتے ہیں وہ بوڑھا جو بے عقل ہو چکا ہو۔[۷] یہ تو ایک طرح کی گالی ہے جو حضرت عثمانؓ کو دی گئی۔ معاذ اللہ کیا حضرت عثمانؓ مخبوط الحواس اور بے عقل بوڑھے تھے جن کو بد معاش اور خبیث النفس سبائیوں نے نہایت ہی بے دردی کے ساتھ شہید کیا؟

۸۔ زاہد جعفری کے زیر بحث مکتوب کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

> کائنات میں آدم سے خاتم تک توریت سے قرآن تک بعد از نبی کیا، اتنی عظیم اور بے داغ ہستی اور کوئی ہے؟ میں اور میری حیثیت کیا جو (حضرت علیؓ) کو افضل صحابہ ہونے کا تاثر دے سکوں۔
> (معارف مارچ ۲۰۲۳ء ص ۷۷)

۔ زاہد جعفری کے ادعا سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک معاذ اللہ حضرت علیؓ کے علاوہ کوئی بے داغ ہستی نہیں ہے۔ یعنی حضرت علیؓ کے سوا سب داغ دار ہیں۔

۹۔ راقم الحروف تقریباً ۱۹۷۵ء سے معارف کا مطالعہ کرتا رہا ہے۔ اللہ شاہد ہے اس طویل ترین مدت میں جناب زاہد جعفری صاحب کے دونوں زیر بحث مکتوب کی طرح ایک مکتوب بھی نظر سے نہیں گزرا جس میں معارف کے معیار واعتبار کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہو:

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

وارث ریاضی

۸۲۲۸۹۰۲۵۴۸

(۲)

معارف کے پچھلے شمارے میں جناب زاہد جعفری کا جو خط جناب وارث ریاضی کے نام شائع ہوا ہے۔ وہ اپنی زبان وبیان کے اعتبار سے پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کو کئی بار پڑھا۔ اور احساس ہوا کہ آج بھی ایسی معیاری اردو لکھنے والے بزرگ موجود ہیں۔ ایسے لوگوں سے ملاقات کا کوئی موقع مل جائے تو زہے نصیب۔ البتہ اس گرامی نامہ میں چند چیزیں محل نظر معلوم ہوتی ہیں۔ اگر اس میں پائی جانے والی تشنگی کا

---

[۷] مولانا وحید الزماں کیرانوی القاموس الوحید جلد ۲ کتب خانہ حسینیہ دیوبند ص ۱۶۷۱

ازالہ کر دیا جائے تو مجھ جیسے بے شمار مبتدیوں کے لیے سکونِ خاطر ہو گا۔ مثلاً اس میں پہلی شق تو یہ ہے کہ: ''ام المومنین عائشہؓ کو امیر معاویہ کا زندہ در گور کر دینا'' (سیوطی، ترمذی، کامل ابن اثیر)۔ اس کا حوالہ سیوطی کے علاوہ مذکورہ دونوں کتابوں کی مراجعت کرنے کے باوجود نہ مل سکا۔ اگر مکمل حوالہ رہتا تو آسانی ہوتی، آخر امام سیوطیؒ جیسے صاحبِ کتب کثیرہ کی کون سی کتاب کی طرف مراجعت کی جائے؟

تحقیق کرنے کے بعد بعض روایات سے اس کے بر عکس معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے سیرتِ عائشہؓ میں ایک ذیلی عنوان ''امیر معاویہ اور حضرت عائشہؓ'' قائم کیا ہے۔ اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ حضرت معاویہؓ کی خلافت میں انہوں نے اپنی زندگی کے اٹھارہ سال بسر کیے۔ ایک بار حضرت معاویہؓ نے حضرت عائشہؓ سے معلوم کیا کہ میرا برتاؤ آپ کے ساتھ کیسا ہے؟ تو انہوں نے جواب میں عرض کیا کہ ٹھیک ہے (سیرت عائشہؓ، ص ۱۴۸)۔ ایسے ہی ایک مرتبہ امیر معاویہؓ نے انہیں خط لکھا کہ مجھ کو مختصر سی کوئی نصیحت کریں، تو اس کے جواب میں حضرت عائشہؓ نے لکھا کہ: ''سلام علیکم، اما بعد! رسول اللہ ﷺ کو میں نے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص انسانوں کی نارضامندی کی پرواہ کئے بغیر خدا کی رضاجوئی کا طالب ہو گا، خدا انسانوں کی نارضامندی کے نتائج سے اس کو محفوظ رکھے گا، اور جو خدا کو ناراض کر کے انسانوں کی رضامندی چاہے گا، خدا اس کو انسانوں کے ہاتھ میں سونپ دے گا۔ والسلام علیک'' (جامع الترمذی، ابواب الزہد)، (حوالہ سابق ص ۱۵۰)۔ آگے مزید سید صاحب نے لکھا کہ: ''حضرت عائشہؓ کی نصیحت کے یہ فقرے در حقیقت امیر معاویہؓ کے حالاتِ زندگی پر ایک مختصر تبصرہ ہے''۔ (حوالہ سابق ص ۱۵۰)۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر امیر معاویہؓ حکومت کے انتظام چلانے میں حضرت عائشہؓ کو اپنا ناصح نہ تسلیم کرتے تو ان کو اس انداز کا خط ارسال کر کے کیوں نصیحت طلب کرتے؟

اتنا ہی نہیں بلکہ امیر معاویہؓ ان کی متروکہ چیز کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں کہ ان کی ایک جنگلی زمین کو تبرکاً ایک بہت بڑی رقم کے عوض میں خرید لیتے ہیں، جیسا کہ سید صاحبؒ نے لکھا ہے کہ: ''حضرت عائشہؓ نے اپنے بعد کچھ متروکات چھوڑے جن میں ایک جنگل تھا۔۔۔امیر معاویہؓ نے اس کو ایک لاکھ درہم میں خریدا'' (حوالہ سابق ص ۱۵۵)۔ اس کے باوجود یہ کہنا کہ امیر معاویہؓ نے ان کو زندہ در گور کر دیا تھا، محلِ نظر ہی نہیں، کس قدر خلافِ عقل معلوم ہوتا ہے۔ ایک عام آدمی سے بھی اس طرح کی امید نہیں کی جا سکتی کجا کہ وہ ایک صحابیٔ رسول ہی نہیں بلکہ کاتبینِ وحی میں بھی شامل ہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ سے ان کا ایک رشتہ برادرِ نسبتی کا بھی ہے۔

اس ضمن میں ایک دل چسپ روایت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے تاریخ طبری کے ہندوستانی فارسی نسخے کے متعلق لکھی ہے کہ جب امام حسنؓ کی تدفین کا معاملہ درپیش آیا تو ان کی خواہش تھی کہ انہیں ان کے نانا رسول اللہ ﷺ کے پہلو (حجرۂ عائشہؓ) میں دفن کیا جائے تو اس کے لیے حضرت عائشہؓ کچھ سپاہیوں کو لے کر ایک سپید گھوڑے پر سوار ہو کر امام حسنؓ کے جنازہ کو روکنے کے لیے خود نکلیں۔ سید صاحب کے الفاظ ملاحظہ ہوں: ''یہ روایت تاریخ طبری کے ایک پرانے فارسی ترجمہ میں جو ہندوستان میں چھپ بھی گیا ہے، نظر سے گزری ہے، لیکن جب اصل متن عربی مطبوعہ یورپ کی طرف رجوع کیا تو جلد ہفتم کا ایک ایک حرف پڑھنے کے بعد بھی یہ واقعہ نہ ملا'' (حوالہ سابق ص ۱۵۱)۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ جناب محترم جعفری صاحب کا مرجع کوئی ایسی ہی کتاب تو نہیں ہے؟

اس خط کی دوسری شق یہ ہے: (انا مدینۃ العلم و علی بابھا، معارف مارچ ۲۰۲۳ ص ۷۷)۔ یہ روایت ترمذی میں موجود ہے، البتہ اس میں باب العلم کی جگہ دار الحکمۃ کا لفظ ہے۔ اور امام ترمذی نے اس پر غریب ہی نہیں بلکہ منکر کا فتویٰ دیا ہے۔ ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں: (انا دار الحکمۃ و علی بابھا)۔ ھذا حدیث غریب منکر۔۔۔ (مناقب علی ابن ابی طالب)۔ اصحاب جرح و تعدیل نے اس حدیث کو منکر قرار دیا ہے۔ یحیٰ بن معین نے تاریخ بغداد ۲۰۵/۱۱ میں اس حدیث کو منکر جدّا لکھا ہے۔ اور امام احمدؒ نے تہذیب التہذیب ۳۲۰/۶ میں اس کے راوی ابو الصلت ہروی پر کلام کیا ہے۔ نیز امام ابن تیمیہؒ نے مجموع الفتاویٰ ۴۱۴/۴ میں اس راوی کے بارے میں یہ لکھا ہے: ''ضعیف رواہ ، ولھذا انما یعدّ فی الموضوعات والمکذوبات'' (یہ روایت کمزور اور بے بنیاد ہے، اسی بنا پر اس کو من گھڑت اور جھوٹی روایت میں شمار کیا جاتا ہے)۔

ملا علی قاریؒ جیسے ماہرِ فن حدیث نے الاسرار المرفوعۃ: ۱۳۸ میں لکھا ہے: قیل لا اصل لہ او باصلہ موضوع۔ اور امام ذہبیؒ نے تاریخ الاسلام ۳۶۸/۱۸ میں اس حدیث کو ''موضوع'' کہا ہے۔ اسی طرح یہ مستدل حدیث بھی ناقابلِ اعتبار ہے: ''اقتلوا نعثلا''۔ امام ابن تیمیہؒ نے اپنی کتاب ''منہاج السنۃ'' میں اسے جھوٹی روایت قرار دیا ہے۔ حاشا وکلا۔ یہ کوئی روایت نہیں ہو سکتی، یہ ام المومنینؓ، جن کے فضائل کے بارے میں قرآن مجید کی آیات نازل ہوئیں، اور وہ مزاجِ نبوی ﷺ کی سب سے بڑی رازداں تھیں۔ ان پر سراسر الزام ہی نہیں بلکہ بہتان تراشی ہے۔ فضل الرحمن اصلاحی

رسید کتب موصولہ

دی فارن وکابولری آف دی قرآن (The Foreign Vocabulary of the Qura'an)**:** ڈاکٹر آرتھر جیفری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی، صفحات ۳۷۶۔ سالِ اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت ۶۰۰ روپے۔ موبائل نمبر: ۷۹۲۵۳۵۱۷۷۲

دینی رسائل کی صحافتی خدمات: سہیل انجم، قاضی پبلیشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، نظام الدین (ویسٹ)، نئی دہلی، صفحات ۳۸۶۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت: ۳۹۵ روپے۔ موبائل نمبر: ۱۱۴۱۸۲۷۴۷۵

رہبر تابانی قلم کاروں کی نظر میں: مرتبین عقیل احمد ضیاء ندوی، عمران علی آبادی، بزم افقر بارہ بنکی، صفحات ۲۹۶، سال اشاعت ۲۰۲۳ء قیمت ۳۰۰ روپے۔ موبائل نمبر: ۹۹۳۵۷۹۰۶۲۰

سیرت فیروز شاہی (انگریزی): مترجم: پروفیسر ایس، ایچ، عسکری، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔ صفحات ۴۸۸، سال اشاعت ۲۰۱۹ء قیمت ۶۰۰ روپے۔ فون نمبر: ۲۶۷۸۱۰۹-۰۶۱۲

شاعرہ مصورہ پروین شیر: ڈاکٹر نذیر فتح پوری، سائرہ منزل ویمان درشن سنجے پارک لوہ گاؤں روڈ پونے، مہاراشٹرا، صفحات ۱۲۸۔ سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت ۲۰۰ روپے۔ موبائل نمبر: ۹۸۲۲۵۱۶۳۳۸

صدائے فلسطین: محمد صابر حسین ندوی، جامعہ ضیاء العلوم کنڈلور، کرناٹک، صفحات ۲۳۲۔ سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت ۳۰۰ روپے، موبائل: ۸۱۲۰۴۱۲۳۹۲

قاموس الخواتین: (جلد اول تا سوم): محمد افروز قادری چریا کوٹی، نعمانی بک ڈپو چریا کوٹ مئو۔ صفحات بالترتیب: ۲۰۷، ۲۰۴، ۲۸۷، سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت: بالترتیب دو دو ہزار روپے۔ موبائل نمبر: ۹۹۳۵۴۶۵۱۸۲

لہو کی خوشبو: عقیل شاطر انصاری، امرین بک ایجنسی، جمال پور احمد آباد۔ صفحات ۲۰۸۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۳۵۰ روپے۔ موبائل نمبر: ۸۴۰۱۰۱۰۷۸۶۔

میں اور میرے خواب: ڈاکٹر نذیر فتح پوری، سائرہ منزل ومان درشن سنجے پارک لوہ گاؤں روڈ پونے، مہاراشٹرا، صفحات ۱۲۸۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۱۲۰ روپے۔ موبائل نمبر: ۹۸۲۲۵۱۶۳۳۸

نکتہ شناسانِ سخن اور پروین شیر: عتیق اللہ، کتابی دنیا دہلی، صفحات ۳۸۴۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۷۵۰ روپے۔ موبائل نمبر: ۹۳۱۳۹۷۲۵۸۹۔

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ (خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2800/-
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	350/-
الغزالی	300/-
المامون	175/-
سیرۃ النعمان	400/-
سوانح مولانا روم	220/-
شعر العجم (اول)	250/-
شعر العجم (دوم)	150/-
شعر العجم (سوم)	125/-
شعر العجم (چہارم)	200/-
شعر العجم (پنجم)	150/-
مکاتیب شبلی (اول)	150/-
مکاتیب شبلی (دوم)	190/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350/-
خطبات شبلی	150/-

موازنہ انیس و دبیر	250/-
اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر	100/-
سفرنامہ روم و مصر و شام	200/-
کلیات شبلی (اردو)	220/-
کلیات فارسی (فارسی)	--
مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
مقالات شبلی دوم (ادبی)	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	170/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی)	150/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری)	150/-
الندوہ (۹ جلدیں)	4735/-
اسلام اور مستشرقین (چہارم)	250/-
الکلام	250/-
علم الکلام	200/-
انتخابات شبلی (سید سلیمان ندوی)	200/-

ISSN 0974-7346 Ma'arif (Urdu) Print MAY 2023 Vol. 210/05

RNI No. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/2023-25

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O. Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P., India

Tel. 06386324437 Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین کی چند اہم مطبوعات

سیرت عمر بن عبدالعزیز	مولانا عبدالسلام ندویؒ	100/-
مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	پروفیسر اشتیاق احمد ظلی	250/-
مطالعات شبلی	״ ״	550/-
حیات سعدی	خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
شبلی شناسی کے اولین نقوش	پروفیسر ظفر احمد صدیقی	600/-
شبلی کی آپ بیتی	مرتبہ: ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
امام رازی	مولانا عبدالسلام ندویؒ	320/-
حیات سلیمان	شاہ معین الدین احمد ندویؒ	600/-
تذکرۃ المحدثین (اول)	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	200/-
تذکرۃ المحدثین (دوم)	״ ״	225/-
تذکرۃ المحدثین (سوم)	״ ״	300/-
محمد علی کی یاد میں	سید صباح الدین عبدالرحمنؒ	120/-
مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	240/-
ابن رشد	محمد یونس فرنگی محلیؒ	330/-
تاریخ اسلام (اول و دوم مجلد)	شاہ معین الدین احمد ندویؒ	375/-
تاریخ اسلام (سوم و چہارم مجلد)	״ ״	500/-
تاریخ صقلیہ اول	سید ریاست علی ندویؒ	400/-
تاریخ صقلیہ دوم	״ ״	400/-
اسلام میں مذہبی رواداری	سید صباح الدین عبدالرحمن	250/-
یہود اور قرآن	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	150/-
تاریخ ارض القرآن	مولانا سید سلیمان ندویؒ	375/-